قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

فروری 2019ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

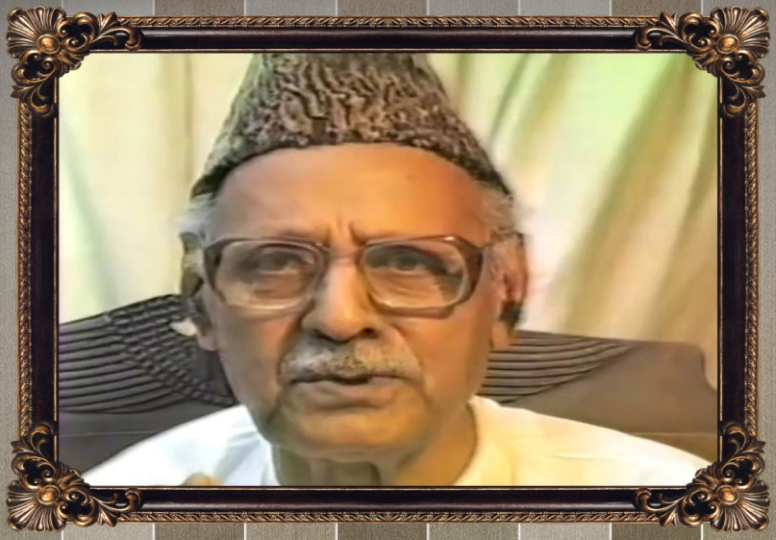

مجھے اپنے فہم قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو و خطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز، معراجِ انسانیت)

طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرت مقدسہ، شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جنوری 2019ء

جلد 72 | شمارہ نمبر 1

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: کشمیر اقبالؒ کی نظر میں	ادارہ	4
اسلام کے مقابل اسلام	پرویزؒ	10
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	پرویزؒ	20
کیا ہر شخص پارلیمنٹ کو جوابدہ ہے؟	خواجہ ازہر عباس، کراچی	30
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان (قسط نمبر 24)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	44

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Principle for Success and Reasons for Downfall – By Sir Syed, 1896

(ترقی کے اصول اور تنزل کے وجوہ)

(Translated by: Mansoor Alam)

[*Maqalaat-e Sir Syed; Ed. Maulana Ismail Panipati; Publisher, Majlis-e Taaqqi-e Adab, Lahore, 1963*]

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کشمیر اقبالؒ کی نظر میں

علامہ اقبالؒ کو کشمیر سے قلبی لگاؤ تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ خود کشمیری الاصل تھے ___ وہ تو، وہ درویش خدامست تھے جس کے متعلق انہوں نے کہا تھا کہ ___ گھر اس کا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند ___ اصل یہ ہے کہ اہلِ کشمیر کی جگر سوز مظلومیت نے اقبالؒ کے قلب حساس سے کشمیر کی یاد کبھی محو نہیں ہونے دی۔ اس نے اپنے کلام اور مکتوبات میں جا بجا کشمیر کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس تذکرہ کے ساتھ ہی اس کی نگہ دُوررس نے اس حقیقت کا بھی مشاہدہ کر لیا تھا کہ اہلِ کشمیر کی محکومیت زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کی یخ بستہ وادیوں سے روحِ انقلاب ابھریگی اور اپنی غلامی کے اطواق وسلاسل کو توڑ کر رکھ دے گی۔ یہ کچھ اقبالؒ نے 1938ء سے پہلے کہا تھا۔ دیکھئے کہ حالات اس کی دیدہ وری کی کس طرح تصدیق کرتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔

میرا عقیدہ ہے کہ کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔

پھر انہوں نے مسلم کانفرنس منعقدہ 1932ء کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا:

''کشمیر کے سلسلے میں اس کی ضرورت نہیں کہ میں واقعات کے اس پس منظر کو بھی بیان کروں جو اس ملک میں حال ہی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا بظاہر اچانک قیام جس کا شرارِ خودی تقریباً مردہ ہو چکا تھا، باوجود ان مصائب کے جو اس قیام کا لازمی نتیجہ ہیں ہر اس شخص کے لئے مسرت کا باعث ہے جس کی نگاہ عصرِ حاضر کی ایشیائی تحریکاتِ آزادی کے محرکات پر ہے۔ اہالیانِ کشمیر کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی ہونہار اور ہنرمند قوم کا اپنے تشخص میں اعتماد کا ازسرِ نو احیا آخر کار نہ صرف خود ان کے لئے بلکہ ہندوستان بھر کے لئے تقویت کا باعث ہوگا۔ سب سے زیادہ قابلِ مذمت فرقہ وارانہ منافرت ہے جو اس وقت ہندوستان میں عام ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی اہلِ کشمیر سے قدرتی دلچسپی سے ہندوؤں نے جوابی تحریک شروع کر دی ہے جس کا مقصد از رہِ یاس یہ ہے کہ پان اسلام ازم اور برطانوی تسلط کے ہوے کھڑے کر کے کشمیر کی بربری حکومت کو بچایا جائے۔

مظلومیت کی داستان:

وہ جاوید نامہ میں، شاہ ہمدان سے اپنی ملاقات کے وقت کہتے ہیں:

1۔ زیرِ گردوں آدم آدم راخورد ملتے بر ملتے دیگر چرد

2۔ جاں زاہلِ خطہ سوزد چوں سپند خیزداز دل نالہ ہائے درد مند

3۔ زیرک ودراک وخوش گل ملتے است در جہاں تر دستی او آیتے است

4۔ ساغرش غلطندہ اندر خون اوست در نے من نالہ از مضمون اوست

5۔ از خودی تا، بے نصیب افتادہ است در دیارِ خود غریب افتادہ است

6۔ دست مزدِ او بدست دیگراں ماہی رودش بہ شستِ دیگراں

7۔ کاروانہا سوئے منزل گام گام کار او نا خوب و بے اندام و خام

8۔ از غلامی جذبہ ہائے او بمرد آتشے اندر رگِ تاکش فسرد

9۔ تانہ پنداری کہ بودست ایں چنیں جبہہ را ہموارہ سود است ایں چنیں

10۔ در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جانبازو پردم بودہ است

11۔ کوہ ہائے خنگ سارے اونگر آتشیں دستِ چنارے اونگر

12۔ در بہاراں لعل می ریزدزسنگ خیزد از خاکش یکے طوفان رنگ

13۔ لکہ ہائے ابر در کوہ ودمن پنبہ پراں از کمان پنبہ زن

14۔ کوہ و دریاو غروب آفتاب من خدارا دیدم آنجابے حجاب

ترجمہ:

(1) آسمان کے نیچے (اس دنیا میں) آدمی، آدمی کو کھا رہا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کو لوٹ رہی ہے۔

(2) میری جان خطہ کشمیر کے لوگوں کے حالات دیکھ کر سپند (حرمل) کے دانے کی طرح چٹخ (تڑپ) رہی ہے۔ اور میرے دل سے درد بھرے نالے اُٹھتے ہیں۔

(3) کشمیری قوم ایک باریک بیں بہت سوجھ بوجھ والی دانشمند اور خوش شکل ہے۔ دنیا میں اس کی ہنرمندی ایک دلیل (مثال) ہے۔

(4) اس کا پیالہ اس کے اپنے خون میں لت پت (ڈوبا ہوا) ہے۔ میری بانسری سے اسی کے حالات کی فریاد نکل رہی ہے۔

(5) جب سے یہ قوم خودی سے بے نصیب ہوگئی ہے وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کے رہ گئی ہے۔

(6) اس کے ہاتھوں کی مزدوری/کمائی دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے دریا کی مچھلی دوسروں کے کانٹے میں پھنسی ہوئی ہے۔

(7) دوسری قوموں کے قافلے (ترقی کی) منزل کی طرف قدم بقدم چلے جا رہے ہیں لیکن اس (بدقسمت قوم) کا کام ناخوب بھی ہے اور ان گھڑت اور ناقص بھی۔

(8) غلامی سے اس کے جذبے ختم ہو گئے ہیں اور اس کی تاک (انگور کی رگ) کے اندر آگ بجھ گئی ہے۔ (شراب خشک ہو گئی ہے)۔

(9) تو کہیں یہ نہ سمجھ کہ یہ قوم ہمیشہ ایسی ہی رہی ہے اور اسی طرح اس نے ہمیشہ دوسروں کے آگے اپنی پیشانی رگڑی ہے۔

(10) وہ کبھی صف شکن بھی رہی ہے اور زبردست (غالب) جانباز اور حوصلہ مند رہی ہے۔

(11) اس (کشمیر) کے برف پوش پہاڑ دیکھ اور یہاں کے درختِ چنار کے آتشیں ہاتھ یعنی پتے دیکھ۔ (چنار کے پتے سرخ ہوتے ہیں جنہیں آگ کی طرح کا کہا گیا ہے)۔

(12) موسم بہار میں یہاں کے پتھروں سے لعل اگتے ہیں۔ (لالہ کے سرخ رنگ کے پھول) یہاں کی مٹی سے رنگ کا ایک طوفان اُٹھتا ہے (جگہ جگہ رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں)۔

(13) پہاڑ اور وادی میں بادلوں کے ٹکڑے اس طرح اُڑتے پھرتے ہیں جیسے روئی دُھنیئے کی کمان سے دُھنکی ہوئی روئی اُڑتی ہے۔ (یہ منظر بھی بڑا دلکش اور دلفریب ہوتا ہے)۔

(14) وہاں کے پہاڑ، دریا اور سورج کا وقتِ غروب (اتنا خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں کہ) میں نے وہاں خدا کو بے حجاب دیکھا ہے۔ (اللہ تعالیٰ کا جمال بے نقاب نظر آتا ہے)۔

اس مقام پر غنی کاشمیری کی روح اقبالؒ سے کہتی ہے:

1۔ مرغکے می گفت اندر شاخسار — باپشیزے می نیرزد ایں بہار
2۔ لالہ رست و نرگس شہلا دمید — بادِ نو روزی گریبانش درید
3۔ عمر ہا بالید ازیں کوہ و کمر — نستر از نورِ قمر پاکیزہ تر
4۔ عمر ہا گل رخت بربست و کشاد — خاکِ ما دیگر شہاب الدین نزاد

ترجمہ:

(1) وہاں شاخوں میں بیٹھے ایک پرندے نے مجھ سے کہا کہ اس انمول بہار کی قیمت تو ایک کوڑی کے برابر بھی نہیں ہے۔

(2) لالہ کے پھول اُگے اور نرگسِ شہلا (اعلیٰ قسم کا سیاہ چشم نرگس کا پھول) پھوٹی۔ بادِ بہار نے اس سرزمین کا گریبان پھاڑ دیا ہے۔ مطلب یہ کہ موسمِ بہار کی ہوا سے لالہ و نرگسِ شہلا اور کئی پھول کھل اُٹھے۔

(3) اس کے پہاڑوں اور ان کے درمیانی راستوں میں مدتوں سے چنبیلی کے ایسے پھول کھل رہے ہیں جو چاند کی روشنی سے زیادہ پاکیزہ زیادہ چمکدار اور سفید تھے۔

(4) اس (وادی کشمیر) میں مدتوں گلاب کے پھول کھلتے اور مرجھا جاتے رہے لیکن ہماری سرزمین سے کوئی اور شہاب الدین پیدا نہ ہوا۔

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر — کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک — مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوب سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بے دردیِ ایام کی — کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ — ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر

اس قوم کے ساتھ کیا ہوا؟

1۔ بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی — حرفے زما بمجلسِ اقوام باز گو
2۔ دہقان و کشت و جوی و خیاباں فروختند — قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

ترجمہ:

(1) اے بادِ صبا! اگر جنیوا کی طرف تیرا گزر ہو تو وہاں ہماری طرف سے مجلس اقوام سے ہماری یہ بات کہنا۔ (علامہ نے لیگ آف نیشنز کو ''پیام مشرق'' میں ''چند کفن چوروں کی مجلس'' کہا ہے کہ یہ بظاہر تو قوموں کو انصاف دینے کے لئے قائم ہوئی تھی لیکن عملاً اس کے ذریعے کمزور قوموں کو مزید کمزور کرنے اور طاقتور قوموں کو مزید طاقتور بنانے کا یہ ایک ذریعہ تھا۔)

(2) کسان اور کھیت اور ندیاں اور کیاریاں انہوں نے بیچ دیں۔ انہوں نے ایک قوم کو بیچ دیا اور کس قدر سستا بیچ دیا۔ (انگریز حکمرانوں نے اپنے لالچ اور مسلمانوں کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے کشمیر کو ایک ہندو ڈوگرہ کے ہاتھ معمولی قیمت پر بیچ دیا تھا۔)

آثارِ حیات:

لیکن اقبالؒ کو اس (بظاہر) مردہ قوم میں زندگی کے آثار نمایاں طور پر دکھائی دیتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو — تھر تھراتا ہے جہانِ چار سوو رنگ و بو
پاک ہوتا ہے ظن و تخمین سے انساں کا ضمیر — کرتا ہے ہر راہ کو روشن چراغِ آرزو
وہ پرانے چاک جن کو عقل سی سکتی نہیں — عشق سیتا ہے انہیں بے سوزن و تارِ رفو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش — حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

دراج کی پرواز میں ہے شوکتِ شاہیں — حیرت میں ہے صیاد یہ شاہیں ہے کہ دراج

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا چشمِ مجبور وہ مردہ کہ تھا بانگِ سرافیل کا محتاج

جس خاک کے ضمیر میں ہے آتشِ چنار ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

نصیب خِطّہ ہو یا رب وہ بندۂ درویش کہ جس کے فقر میں انداز ہوں کلیمانہ
چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یک دانہ

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے
منجم کی تقویمِ فردا ہے باطل گرے آسماں سے پرانے ستارے
ضمیرِ جہاں اس قدر آتشیں ہے کہ دریا کہ موجوں سے ٹوٹے ستارے
زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے
ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے

غنی کاشمیری کے الفاظ میں:

وہ جاوید نامہ میں، غنی کاشمیری کی زبان سے، اس انقلاب کے امکان کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

1۔ ہیچ میدانی کہ روزے در ولر موجۂ می گفت با موج دگر
2۔ چند در قلزم بیک دیگر زنیم خیز تا یک دم بساحل سر زنیم
3۔ زادۂ ما یعنی آں جوئے کہن شورِ او در وادی و کوہ و دمن!
4۔ ہر زماں برسنگِ رہ خود را زند تابنائے کوہ رابر می کند
5۔ آں جواں کوشہر و دشت و در گرفت پرورش از شیرِ صد مادر گرفت
6۔ سطوتِ او خاکیاں را محشرے است ایں ہمہ از ماست، نے از دیگرے است
7۔ زیستن اندر حدِ ساحل خطاست ساحلِ ماسنگے اندر راہِ ماست
8۔ باکراں در ساختن مرگِ دوام گرچہ اندر بحر غلطی صبح و شام
9۔ زندگی جولاں میانِ کوہ و دشت
اے خنک موجے کہ از ساحل گذشت

ترجمہ:

(1) کیا تجھے کچھ علم ہے کہ ایک روز ولر جھیل میں ایک موج نے دوسری موج سے (کیا) کہا؟

(2) ہم کب تک اس سمندر (جھیل) میں ایک دوسری سے ٹکراتی رہیں گی، تو اُٹھ تاکہ ہم کچھ دیر ساحل سے سر ٹکرائیں۔

(3) ہماری پیدا کی ہوئی وہ پرانی ندی جس کا شور وادی، پہاڑ اور دمن میں ہے۔

(4) وہ ہر لحہ خود کو راستے کے پتھروں سے ٹکراتی ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی بنیاد تک کو کھود دیتی ہے۔ (پہاڑ کے اندر سے بھی راستہ بنالیتی ہے)

(5) وہ جوان دریا جس نے شہر و بیابان اور وادی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، اس کی پرورش سو ماؤں کے دودھ سے ہوئی ہے۔

(6) اس کا دبدبہ انسان کے لئے ایک قیامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ (جب اس میں سیلاب آتا ہے تو وہ بڑی تباہی مچاتا ہے۔) یہ ہمارے اندر سے نکلا ہے کسی اور جگہ سے تو نہیں نکلا۔ تو یہ سب کچھ کشمیر ہی کی بدولت ہے۔ (گویا کشمیر نہ ہوتا تو جہلم بھی نہ ہوتا۔)

(7) ساحل کی حدود میں زندگی بسر کرنا غلطی ہے۔ ہمارا ساحل ہمارے راستے کا پتھر بنا ہوا ہے۔

(8) ساحل سے موافقت کر لینا (کناروں کے اندر رہنا) ہمیشہ کی موت ہے، خواہ اے موج تو سمندر میں صبح و شام کیوں نہ لڑھکتی رہے، طوفان ہی کیوں نہ برپا کرتی رہے۔

(9) زندگی تو کوہ و دشت میں اپنی جولانیاں دکھانا ہے۔ مبارک ہے وہ موج جو ساحل سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد غنی واضح تر الفاظ میں کہتا ہے:

1۔ دل میانِ سینۂ شاں مردہ نیست اخگرِ شاں زیرِ خ افسردہ نیست!

2۔ باش تا بینی کہ بے آوازِ صور ملتے برخیزد از خاکِ قبور!

ترجمہ:

(1) ان (اہل کشمیر) کے سینوں میں مردہ دل نہیں ہیں۔ ان کا شعلہ (انگارہ) برف کے نیچے دب کر نہیں بجھا۔

(2) ذرا ٹھہر تا کہ تو دیکھے کہ ایک ملت (اہل کشمیر) صور کی آواز کے بغیر ہی قبروں کی مٹی سے اٹھنے والی ہے۔ (وہ وقت قریب ہے جب اہلِ کشمیر غلامی سے نجات پالیں گے)۔

بالآخر اس ''خاکِ قبور'' سے ایک زندۂ و تابندہ ملت اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خدا اُس کا حافظ و ناصر ہو، اور اسے اس کے ہر بلند مقصد میں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے تاکہ ''منتظرِ یومِ مکافات'' دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ظالم پنپ نہیں سکتا۔

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!

اسلام کے مقابل اسلام

قائداعظم کے یومِ پیدائش کی تقریب، منعقدہ 24 دسمبر 1982ء پر پرویزؔ صاحب کا خصوصی درس

غالبؔ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ــــ ''قدرِ شعرِ من بگیتی، بعدِ من خواہد شدن ــــ دنیا میں میرے شعر کی قدر میرے بعد ہوگی ــــ اقبالؔ نے بھی اسی احساس کا اظہار کیا تھا جب کہا تھا کہ ــــ من ندائے شاعرِ فرداستم۔ ''میں آنے والے شاعر کی آواز ہوں۔ میرا زمانہ میرے بعد آئے گا'' مَیں اپنے آپ کو ان اربابِ فکر و بصیرت کے زمرے میں شمار کرنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا، لیکن اس حقیقت کے اظہار سے باز بھی نہیں رہ سکتا کہ جو کچھ میں اسلام کے متعلق کہہ رہا ہوں وہ آنے والے مؤرخ کے لئے یادداشت کا کام دے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جب یہاں اسلام پر یہ کچھ بیت رہی تھی تو ایک گوشے سے قرآن کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔ قرآن کریم نے اپنے اولین مخاطبین (کفار) کے متعلق کہا تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لوگوں سے کہتے تھے کہ لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ (41:26)۔ تم اس قرآن کی آواز اپنے کان میں نہ پڑنے دو۔ وَالْغَوْا فِيْهِ (41:26) اور اس قدر شور مچاؤ کہ دوسرے بھی اسے سُننے نہ پائیں۔ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ (41:26) بس یہی ایک طریق جس سے تم، قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر غالب آسکو گے۔ اگر لوگوں نے اس کی آواز سن لی تو پھر وہ تمہارے قابو نہیں آسکیں گے۔ یہی ٹیکنیک ہمارے زمانے کے اس ہجوم نے اختیار کر رکھی ہے جو نہیں چاہتے کہ قرآن کی آواز بلند ہونے پائے۔ قرنِ اوّل کے معاندین کے مقابلہ میں ان کے پاس پراپیگنڈہ کے بڑے وسیع اور شدید الاثر ذرائع ہیں۔ عوام ویسے ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ اس پراپیگنڈہ نے ان کے جذبات کو اس قدر دو آتشہ بنا دیا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آتش گیر مادہ بن جاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے دانشور طبقہ کا تعلق ہے، جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے وہ مذہب کے نام سے متنفر یا کم از کم (Disinterested) ہو چکے ہیں۔ میرے زمانۂ ملازمت کی بات ہے۔ دفتر میں ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ تھا اور اس کے سیکشن میں ایک ''احمدی'' کلرک۔ ''احمدیوں'' کا تو یہ معمول ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک تک اپنا لٹریچر پہنچاتے ہیں۔ ایک دن اس کلرک نے اپنا کچھ لٹریچر اس سپرنٹنڈنٹ کو دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ لٹریچر کس موضوع سے متعلق ہے؟ اس نے کہا کہ یہ مذہب سے متعلق ہے۔ اُس نے وہ کاغذات اس کی طرف لوٹا دیئے اور کہا کہ انہیں گرجا کے پادری کے پاس لے جاؤ، اسے اس کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے نہیں، ہمارے دانشور طبقہ کی حالت کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ

مذہب ایک ایسا (Subject) ہے جس کا تعلق مولوی صاحبان سے ہے۔ ان سے اُس کا کچھ واسطہ نہیں۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس، مسٹر جسٹس آفتاب حسین نے اس بارے میں گلہ بھی کیا ہے انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے علماء اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے وفاقی شرعی عدالت سے تعاون کریں۔ انہوں نے کہا کہ:

''انہوں نے بارہا اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے لیکن ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں وکلا اور علماء حضرات نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ ''علماء زبانی کلامی تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عملاً انہوں نے تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وفاقی شرعی عدالت کی دعوت پر چند علماء نے کچھ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں اپنی آراء پیش کی تھیں لیکن انہوں نے اپنی اس رائے میں صرف فقہ کو تحریر کر دیا تھا اور اکثر جگہوں پر قرآن اور حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس لئے ان کی آراء ہماری مناسب مدد نہیں کر سکیں۔ انہوں نے کہا کہ وکلاء بغیر فیس کے کوئی مشورہ نہیں دیتے، اس لئے وکلاء نے وفاقی شرعی عدالت سے بھی قابل ذکر تعاون نہیں کیا۔'' (روزنامہ جنگ، لاہور، مورخہ 19 نومبر 1982ء)

یہ اُس طبقہ کا حال ہے جس کا براہِ راست تعلق مذہب اور قوانین سے ہے۔ اس سے مذہب کے ساتھ دلچسپی کے متعلق دیگر طبقات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اندریں حالات آپ سوچئے کہ قرآن کی جو آواز میں بلند کر رہا ہوں اس پر کون کان دھرے گا؟ عوام سے کہہ دیا گیا ہے کہ ''یہ کفر ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ اس کے قریب تک نہ جانا'' خواص نفسِ مذہب ہی سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ میں اس آواز کو بلند کئے جا رہا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے اسے اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس قحط الرجال کے باوجود، ایسے سعادت مند حضرات موجود ہیں جو اس آواز میں دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسرے اس لئے کہ میری یہ آواز ریکارڈ میں رہے تا کہ آنے والا مؤرخ اس سے استفادہ کر سکے۔ (ورنہ) جہاں تک قرآن کے ساتھ اس دور کا عمومی تعلق ہے، اس کی حالت ایسی ہو چکی ہے جس کا اقبالؔ نے ان حقیقت افروز لیکن نہایت حسرت افزا الفاظ میں اظہار کیا تھا کہ ___ خوابم زیادرفتہ تعبیرم آرزوست ___ میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ تو بھول گیا ہے لیکن میں یہ آرزو دل میں لئے بیٹھا ہوں کہ اس کی تعبیر میرے سامنے آ جائے۔

اقبال کا خواب:

اقبالؔ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین (نظامِ حیات) حضور ﷺ کی وساطت سے نوعِ انسان کو عطا فرمایا تھا اور جسے آپؐ نے عملاً نافذ کر کے دکھا دیا تھا، اسے پھر سے زندہ حقیقت بنا کر دُنیا کو بتا دینا چاہئے کہ یہ ہے وہ فردوسِ بریں جسے بنی آدم نے تم کو دیا تھا۔ اس نے کہا کہ جو اسلام، مسلمانوں کے مختلف ممالک میں رائج چلا آ رہا ہے، وہ

دین نہیں جو صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا۔ یہ وہ مذہب ہے جو صدرِ اوّل کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ حقیقی دین کے احیاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا خطۂ زمین ہو جس میں پہلے سے کوئی نظامِ حیات ثبت نہ ہو۔ اس میں قرآن کی بنیادوں پر اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے 1930ء میں اس خطۂ زمین کے حصول کو قوم کے سامنے بطورِ نصب العین رکھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

''اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ اُن اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب وتمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔'' (خطبۂ صدارت، الٰہ آباد)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے ''خطباتِ تشکیلِ جدید'' میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں کہا تھا:۔

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور دُرشت تہیں جم گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھُرچ کھُرچ کر الگ کر دیا جائے، اور حُریّت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔ (چھٹا خطبہ)

وہ جانتے تھے کہ اس اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی۔ کیونکہ مذہب ان کے لئے ذریعۂ معاش بن چُکا ہے، اور جب حکومت کے ساتھ ان کی ساز باز ہو جائے تو یہ ذریعۂ معاش ہی نہیں رہتا، وجۂ حصولِ اقتدار بھی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقی اسلام میں اس انسٹی ٹیوشن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ آپ کلامِ اقبالؒ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں آپ کو مُلّا کی مخالفت، شدومد سے ملے گی۔ وہ ان کے وجود کو مسلمانوں کی تباہی کا اولیں سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ مسلمان سے واضح طور پر کہتے ہیں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری اے کُشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری

اپنے کلام کے علاوہ، وہ دیگر مقامات پر بھی اسی خطرہ کو دُھراتے رہے۔ اُنہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس (منعقدہ مارچ 1932ء) میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا:

ملائیت کے خلاف:

ہمارے دین کی یہ بلند فطرتی مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے، اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم جذبات اور حالات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں۔ جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا

ہے۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس نئی مملکت کے نظام کی بنیاد قرآن خالص ہوگی۔ اور یہی چیز ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے بناءِ مخالفت ہوگی۔ اس لئے ان کا مقابلہ کرنا بڑی جرأت طلب اور صبر آزما مہم ہوگی۔ انہوں نے اپنے خطبات میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

''یہ سوال زُود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دُنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر بڑھے۔۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حُریت پسند قلب ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:

حسبنا کتاب اللہ

ترجمہ: ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ جس نظام کی بنیاد قرآنِ خالص پر ہوگی وہ دنیا کے ہر غیر قرآنی نظام کا مخالف ہوگا۔ اس میں ہر قسم کی شخصی حکومت کی مخالفت ہوگی خواہ وہ ملوکیت ہو یا آمریت، حتیٰ کہ مغرب کی جمہوریت بھی۔ اس میں مغرب کی استعماریت کی بھی مخالفت ہوگی۔ اور وطن اور نسل کی بنیادوں پر نیشنلزم کی بھی۔ اس میں نہ مغرب کا نظامِ سرمایہ داری بار پا سکے گا نہ ہی روس کا اشتراکی نظام۔

ہر طرف سے مخالفت:

اس اعتبار سے اس جدید مملکت کی مخالفت مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت ہی کی طرف سے نہیں ہوگی۔ بلکہ دُنیا کی ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔ بنابریں انہیں اس کا احساس تھا کہ اس مملکت کے قیام اور استحکام کی مخالفت ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔ کوئی قوم بھی اسے برداشت نہیں کر سکے گی کہ یہ نظام دُنیا کے کسی خطے میں بھی قائم ہو جائے۔ چنانچہ کلامِ اقبال میں اقوامِ مغرب اور تہذیبِ مغرب کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے (اور اس تکرار و اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے) اس سے مقصود قرآنی مسلمانوں کو متنبہ (Warn) کرنا تھا کہ تمہاری اس اسکیم کی مخالفت تمام دُنیا کی طرف سے ہوگی۔

قائداعظمؒ:

اقبالؒ یہ کہتے ہوئے دُنیا سے چلے گئے تو اس کے بعد قائداعظمؒ اس پکار کو لے کر آگے بڑھے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ اس مملکت میں اندازِ حکومت کس قسم کا ہوگا۔ فرمایا کہ یہ اسلامی مملکت ہوگی اور اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ

پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(انٹرویو حیدرآباد، دکن، شائع شدہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 فروری 1942ء)

انہوں نے بھی اقبالؒ کے تتبع میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ اس مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ انہوں نے 1938ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوانوں سے کہا تھا کہ:

''مسلم لیگ نے (کم از کم) ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے۔۔۔ اس نے تمہیں اس ناخوش آئند طبقہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔'' (تقاریر، جلد اوّل، ص:48)

انہوں نے مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی (11 اپریل 1946ء) میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

''اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیا کریسی نہیں۔ ہم تھیا کریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔'' (طلوعِ اسلام، ستمبر 1972ء)

انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد فروری 1948ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل اہل امریکہ کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا تھا کہ:

تھیا کریسی نہیں ہوگی:

پاکستان میں کسی قسم کی تھیا کریسی نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظم کی کوئی معیاری سوانح حیات، اس لئے یہ چیز قوم کے سامنے آئی ہی نہیں کہ تحریکِ پاکستان میں متصادم محاذ کون کون سے تھے اور ان میں وجۂ نزاع اور بناء مخالفت کیا تھی۔ یہ متصادم محاذ تھے مذہبی پیشوا اور اقبالؒ اور قائداعظمؒ اور بناء مخاصمت تھی اسلام کا وہ تصور جسے علماء پیش کرتے تھے اور اس کے برعکس وہ تصور جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیش نظر تھا۔ یہ جنگ تھی درحقیقت اسلام کے دو تصورات کے درمیان ــــــ ایک وہ اسلام جو کتاب اللہ پر مبنی تھا۔ دوسرا وہ اسلام جو ہمارے دور ملوکیت کا وضع کردہ تھا اور جس کے علمبردار ہمارے علماء تھے، اور ان کے ہم نوا وہاں کے ہندو، ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر قرآنی نظام ان کی دیوار بہ دیوار مملکت (پاکستان) میں قائم ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر وہاں کی (مسلم اور غیر مسلم) آبادی حکومت کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ اس لئے وہ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مملکت پاکستان میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام کارفرما ہو جائے۔ آپ دیکھئے کہ وہاں یہ ہر دو تصورات کس طرح ایک دوسرے سے متصادم

تھے۔ (چونکہ اس جنگ کی ابتداء ہندوستان کی سرزمین سے ہوئی تھی اس لئے ہم اس کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اقوامِ مغرب نے اس جنگ میں کیا رول ادا کیا ہے اور ابھی تک کر رہی ہیں)۔

علماء کا اسلام:

ہندوستان میں علماء کا مسلک یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو شخصی قوانین۔ نکاح، طلاق وغیرہ کی آزادی ہو، تو حکومت خواہ سیکولر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ (ان علماء کے سرخیل) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ:

''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔'' (زمزم، 7 جولائی 1938ء)

اس اسلام کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ مولانا مذکور کے ارشاد کے مطابق:

''کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ (مولانا مدنی کا پمفلٹ، متحدہ قومیت اور اسلام، ص: 61) جسے انہوں نے علامہ اقبالؒ کے جواب میں شائع کیا تھا۔)''

یہ تھا اسلام کا وہ تصور جسے علماء کرام پیش کرتے تھے اور جس کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ اس کے برعکس داعیان پاکستان کے پیش کردہ اسلام کا تصور یہ تھا کہ اسلام کو اسی صورت میں آزاد تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کا نفاذ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں ہو۔ اسلام میں مملکت کی بنیاد ہی دین پر استوار ہوتی ہے۔ اس تصور کے اسلام کے متعلق ہندو کا ردعمل کیا تھا۔ اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اوائل 1938ء میں جب مملکت پاکستان کا مقصود و مطلوب اُبھر کر سامنے آ گیا تھا، کانگریس کے (اُس زمانے کے) مشہور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، قائداعظمؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

''اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو اُن کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لا جائے۔ اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عصر حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی، اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔'' (ہندوستان ٹائمز، 5 ستمبر 1938ء)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ:

''حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں، یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔'' (ہندوستان ٹائمز 14 نومبر 1939ء)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا:

''اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔۔۔ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔'' (ہریجن، 9 دسمبر 1946ء)

جب مارچ 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی، تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

''میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں، ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔'' (ہندوستان ٹائمز، 7 اپریل 1947ء)

اس کے دو ہی ماہ بعد مسٹر گاندھی نے پھر کہا کہ:

''اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترکہ عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔'' (ہندوستان ٹائمز، 9 جون 1940ء)

یکم نومبر 1941ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن

بنالیں جہاں طرزِ حکومت، قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے، مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔''

(ٹریبون، 6 نومبر 1941ء)

یہ کچھ ہندوؤں نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا۔ تقسیم ہند کے بعد بھی یہ شعلہ ان کے سینے میں برابر بھڑکتا رہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وہاں کے مشہور اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:

''پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ:

''اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہوجائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کردے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوش گوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوجائے گا۔''

اکتوبر 1948ء میں لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔ (ہندوستان ٹائمز 25 اکتوبر 1948ء)

اس پر اسی اخبار نے اپنی 28 اکتوبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ:

''تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا۔۔۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ ہندو، اُس اسلام کے تو تحفظ کی ضمانت دیتا تھا جسے علماء پیش کرتے تھے لیکن اس اسلام کے تصور تک سے اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے جس کے نفاذ کے لئے مملکت پاکستان (کا پہلے مطالبہ کیا گیا تھا اور بعد میں یہ) وجود میں آگئی تھی۔ اس قسم کی مملکت کی مخالفت میں ہندو کس حد تک جانے کی سوچ رہا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہوگیا تو کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:

''ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہوکر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔''

(Pakistan Faces India....P.99)

اسے پھر ذہن میں رکھئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہندو کو مسلمانوں کی ایک الگ مملکت بنانے پر کوئی خاص اعتراض'' نہیں تھا۔ انہیں اعتراض تھا تو اس پر کہ وہ مملکت (اقبال اور جناح کے تصور کے) اسلام کے نفاذ کا ذریعہ ہوگی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ 1965ء کی جنگ میں عبرت آموز شکست کھانے کے بعد، اُس زمانے کے (ہندوستان کے) وزیر دفاع مسٹر چوّن نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

''پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کُن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے۔''

1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا تھا اور وہاں کی پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز گاندھی کی خدمت میں ہدیۂ مبارک باد پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مسز گاندھی نے جو کچھ کہا تھا وہ ہندو ذہنیت کی پوری پوری غمازی کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

''یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔''

(یہ مسٹر گاندھی کے بقول) باطل نظریہ کیا تھا؟ یہی کہ مملکت کی بنیاد (اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کے) اسلام پر رکھی جائے گی۔

مرحوم مودودی صاحب کی طرف سے مخالفت:

مطالبۂ پاکستان کی سب سے زیادہ شدید مخالفت سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں گذشتہ تیس پینتس سال میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کے دُھرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ (طلوعِ اسلام

نے تو بلکہ 1940ء میں ان کی مخالفت کی تھی۔) ان کا اندازِ مخالفت، نیشنلسٹ علماء سے مختلف تھا لیکن اقبالؒ اور جناحؒ کے پیش کردہ اسلام کو وہ بھی ''کافرانہ'' قرار دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تالیف مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، حصہ سوم میں لکھا تھا:

''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام رائج ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت۔''

(ص:131، 132)

انہوں نے اپنی مخالفت، تقسیمِ ہند کے زمانے تک برابر جاری رکھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپریل 1947ء میں (جب تقسیمِ ہند کا اصولی فیصلہ ہو چکا تھا) ٹانک۔ مدراس اور پٹنہ میں اپنی جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے تاکہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف بھڑکایا جائے، چنانچہ انہوں نے اس وقت بھی تحریکِ پاکستان کو ''غیر اسلامی'' قرار دیا اور (ان کے ایک رفیقِ کار) ملک نصر اللہ خان عزیز (مرحوم) نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالمِ دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں۔ جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیۃً نابلد ہیں اور محض اِدھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سُن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خوفِ خدا سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں تاکہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعات زمین تاکتے پھریں۔ اس کے لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایسی مضبوط اور منظّم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریہ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مر مٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہوگی وہیں وہ اس نظریہ کی حکومت قائم کر لے گی۔

(روئداد جماعت اسلامی، حصہ پنجم، ص:65؛ ص:154)

یعنی ان کے نزدیک بھی، اسلام کے نفاذ کے لئے الگ خطۂ زمین کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی بات نیشنلسٹ علماء کہتے تھے اور ہندو بھی یہی چاہتا تھا۔

(جاری ہے)

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

گذشتہ سے پیوستہ

بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ (5:67)

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

(اس مضمون کی پہلی قسط ماہنامہ طلوعِ اسلام، نومبر 2018ء کے شمارے میں صفحہ نمبر 6 پر شائع ہو چکی ہے۔ اس کی دوسری قسط آپ ملاحظہ فرمائیں شکریہ)

لیکن عقل انسانی کا تجرباتی عمل ابھی یہیں تک پہنچ سکا ہے۔ اس نے ہنوز انسان کو وطن کی تنگ نائے سے نہیں نکالا۔ یعنی اب انسانوں کی تفریق اور قوموں کی تقسیم وطن کے اشتراک کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس نظریہ کو نیشنلزم کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان اپنے وضع کردہ اس نظریہ کے نتائج سے مطمئن ہے یا اس کے ہاتھوں نالاں ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں، خود اس نظریہ پر عمل پیرا اقوام مغرب کی زبانی سنئے۔ پروفیسر الفریڈ کوبن جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس باب میں لکھتا ہے۔

> قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان قوموں کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حق استقلال و خود مختاری کو مسلط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لیے خود مختاری کی مدعی ہوں۔ ان وجوہات کی بنا پر لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظام حکومت کے لئے نیشنلزم کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔

پروفیسر کوبن اپنی کتاب (Creative Freedom) میں لکھتا ہے کہ جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبہ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

پروفیسر ولیم برنٹ نے دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ:

> اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوام یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہیں الجھیں گی کیوں کہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے۔ لیکن نیشنلزم کا وہ جذبہ

جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے باقی رہے گا۔ اس لئے مستقبل میں جنگ کو ختم کرنے کے لئے، آج کی سیاستدانی کی پرکھ اسی سے ہوگی کہ موجودہ جنگ کے بعد نیشنلزم کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔

(Foundation of human conflict.)

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب (The hopes for a changing world) میں لکھتا ہے:

ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے۔ وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ (پھر تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔

بڑی مصیبت یہ ہے کہ یورپ نے نیشنلزم کو محض ایک سیاسی مسلک کی حیثیت سے ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اسے مذہب کی پوزیشن دے رکھی ہے۔ وہاں وطن کو ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے جس کی پرستش ہوتی ہے۔ آلڈوس بکسلے اس باب میں بڑی وضاحت سے لکھتا ہے اور بہ تکرار و اصرار لکھتا ہے کہ:

نیشنلزم ایک بت پرستانہ، مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ وہ مذہب جو فساد و تفریق انسانیت کے لئے ایسا طاقتور کہ کوئی خدا پرست مذہب، فلاح اور وحدت انسانیت کے لئے، اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیشنلزم یا نسل پرستی کا جذبہ بالکل پاگلوں کا مسلک ہے۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

نیشنلزم، جسے ہم نے ایک بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے، کی وجہ سے ساری دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوام عالم کہا جاتا ہے۔ یہ ان میں سے ہر قوم کا ''مملکتی مذہب'' ہے۔ یعنی خدا کے بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پچاس دیوتاؤں میں سے، ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملیکشی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت، خدائے واحد اور احترام آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پاجاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں اس کا وجوب ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے۔

ضمناً ھکسلے نے، نیشنلزم کو آج ایک ''باطل خدا'' کہا ہے۔ اقبالؒ نے آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے کہا تھا کہ:

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اوراس کا نتیجہ یہ بتایا تھا کہ:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اوراس کے بعد مسلمانوں سے تاکید کی تھی کہ:

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے

بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس نیشنلزم کے ہاتھوں جسے اسلام نے فساد آدمیت کی بنیاد قرار دیا تھا، خود اقوام مغرب کے مفکر اور سیاستدان اس قدر گریاں ونالاں ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو چلا ہوا کارتوس کہنے والوں سے کہ اقوام یورپ کا یہ واویلا، اسلامی اصول قومیت کی صداقت کی شہادت ہے یا اس کے ناکارہ ہونے کی دلیل۔

یہ اس مسئلہ کا منفیانہ پہلو تھا۔ یعنی نیشنلزم کی تباہ کاریوں کے خلاف اقوام مغرب کا نالہ وشیون۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس فساد کا علاج کیا ہے؟ پروفیسر برنڈ نے کہا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم قومیت کی جگہ بین الاقوامیت (انٹرنیشنلزم) کو فروغ دیں۔ اس کے خلاف مسٹر (Emeryreves) نے کہا کہ:

ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں۔ (اقوام متحدہ کی ناکامی اس کا بین ثبوت ہے) جو مسئلہ دنیا کے سامنے ہے وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریہ نے انسانی معاشرہ میں فساد برپا کر رکھا ہے۔ لہٰذا کیسے ممکن ہے کہ نیشنلزم، خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے اس کا حل دریافت کردے؟ اس کا حل انسانیت کی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے اوپر جا کر خالص انسانی سطح پر دنیا میں امن قائم کرنا چاہتی ہے۔
(The anatomy of peace)

کیتھولک چرچ کا راندہ درگاہ اسقف (Tellard-df-chardin) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (Bullding of the Earth) میں لکھتا ہے۔

اب اقوام کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصّبات کو ختم کردیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرہ ارض کی تعمیر نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوت انسانیت کا راستہ۔ اب شعور انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوع انسانی کو اپنی آغوش

میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (Hugh Miller) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (The community of man) رکھا ہے لکھتا ہے۔

تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی۔ لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جا سکتا ہے جو انسانوں کو باہم گرجوڑ دے انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہئے جو تمام نوع انسان پر مشتمل ہو۔

جی نہیں چاہتا کہ میں یہ کہے بغیر آگے بڑھ جاؤں کہ جو کچھ اس مفکر نے کہا ہے وہ گویا قرآنی آیات کا ترجمہ ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ (10:19) نوع انسان شروع میں ایک ہی برادری تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا اور مختلف خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ اس میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کے لئے خدا کی طرف سے راہنمائی ملی۔ (2:213) اس نے کہا ہے کہ انسانیت کی بارگاہ میں سب سے بڑے مجرم وہ ہیں جو وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ (2:27) جس بکھری ہوئی انسانیت کو جوڑنے کا خدا نے حکم دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں فساد برپا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

عزیزان من! آپ قرآن کریم کی ان آیات جلیلہ پر غور کیجئے اور پھر پروفیسر ملر کے مذکورہ بالا اقتباس کو دیکھئے اور پھر بتائیے کہ کیا وہ انہی آیات کا ترجمہ نہیں؟ آپ دیکھتے ہیں کہ اپنے غلط نظریات کا ستایا ہوا انسان آخر الامر کس آستانہ پر پہنچ کر پکارتا ہے کہ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی میرے جرم خانہ خراب کو، ترے عفو بندہ نواز میں

انسان جس عالمگیر انسانی برادری کی تلاش میں ہے، اس کی تشکیل کا طریق کیا ہوگا۔ اس کے متعلق سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات (GUNNER MYRDAL) لکھتا ہے:

> ''یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے۔ جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں۔ اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی اور جمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔''

اور اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے کہ:

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس کا کمال ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

(Beyond the welfare state)

اس ''مذہب'' کے متعلق جو (Myrda) کی روح کے نشیمن میں جلوہ بار ہے، ایک اور ممتاز مفکر (Eric Fromm) لکھتا ہے کہ زمانے کے تقاضے کہہ رہے ہیں کہ آئندہ چند صدیوں میں ایک ایسے مذہب کی نمود ہوگی جو:

انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیم کا نشیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابل عمل ضابطہ اخلاق دے گا جو علوم سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوع انسان کا مذہب بن سکے۔

(The sane society)

وقت نہیں، ورنہ میں، عزیزان گرامی قدر بتاتا کہ قرآن کریم کس طرح اس دین کی یہی خوصیات بتاتا ہے جسے اس نے عالمگیر انسانیت کے لئے بطور ضابطہ حیات تجویز کیا ہے۔ اس مفکر نے کہا ہے کہ زمانے کے تقاضوں کی رو سے اس مذہب کی نمود ہوگی اور قرآن کریم نے یہی طریق اپنے مستور حقائق کی نمود کے لئے بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ (41:53) (جوں جوں علم انسانی ترقی کرے گا اور انسانی تقاضے بڑھیں گے) عالم انفس و آفاق کے مستور حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے اور جوں جوں یہ حقائق بے نقاب ہوں گے۔ یہ حقیقت سامنے آتی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے کہا تھا وہ صداقت پر مبنی تھا۔

یہ مذہب اسلام ہی ہوسکتا ہے:

اب رہا یہ سوال کہ دنیا کو جس عالمگیر مذہب انسانیت کی تلاش ہے کیا وہ اسلام کے سوا کوئی اور بھی ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب بھی ہم سے نہیں۔ ایک غیر مسلم کی زبان سے سنئے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ غیر مسلم کون ہے اور کس پایہ کا مفکر ہے۔ یہ عصر حاضر کا سب سے بڑا مورخ، پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی ہے۔ وہ اپنی کتاب The world and the west میں لکھتا ہے۔ اور دیکھئے کہ وہ ایسا لکھتے وقت ہمارے منہ پر کتنے زور سے طمانچہ مارتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''مغرب میں بعض دوسرے تصورات بھی ہیں جن کا باعث فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی ممالک نیشنلزم کے تصور سے بھی اسی طرح متاثر ہوتے

جارہے ہیں جس طرح اور مغربی تصورات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں کا مذہب عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان بلالحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہوگیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جب کہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں ''فاصلہ'' کا تصور آہستہ آہستہ مٹتا جارہا ہے۔ مسلمانوں کا اخوت باہمی کا عقیدہ یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے اور یہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے، برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے جن میں سے ہر ایک، دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہوچکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم وبیش چالیس آزاد مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہوسکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا کہ وہ اس کے تصوراتِ حیات کو آنکھیں بند کئے اپنائے چلے جارہے ہیں۔ ہمیں کم ازکم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے عالمگیر مودت واخوت کے تصور کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصور اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصور، ویسے تو انسانی فلاح کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہوگئی ہے۔''

پروفیسر ٹوئن بی کے نزدیک، دنیا میں عالمگیر برادری متشکل کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظریہ اجتماعیت ہے اور اسے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ اگر یہ نظریہ بھی باقی نہ رہا تو دنیا کا کیا حشر ہوگا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ہاں کی فریب خوردہ ذہنیتوں سے کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے، یا دنیا اسے اپنی نجات کے لئے آخری سہارا قرار دے رہی ہے! اور پھر میں پوچھنا چاہتا ہوں قومیت زدہ مسلمانوں سے کہ وہ سوچیں کہ دنیا ان کے ساتھ کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہے، اور وہ کس طرف جارہے ہیں؟ غالب نے کسی ایسے ہی حسرت آمیز منظر سے متاثر ہوکر کہا تھا کہ ؎

تماشہ کر اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

نظام سرمایہ داری:

اب میں عزیزان! انسانی زندگی کے ایک اور اہم گوشے کی طرف آنا چاہتا ہوں۔ یہ وہ گوشہ ہے جس نے عصر حاضر میں خاص طور پر بڑی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ یعنی معاشی نظام کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا مدار، زمین کی پیداوار پر ہے۔ جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی اس نے دیکھا کہ اس ذریعہ زیست پر بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ چلا آرہا ہے اور وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں، غلاموں سے کام کراتے ہیں۔ قرآن نے آکر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ

ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہوسکتی ہے، نہ کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زاید (فاضلہ) دولت رہ سکتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو غلامی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور دوسری طرف نظام سرمایہ داری کی بساط الٹ گئی اور قرآن کی حامل قوم نے ایسا معاشرہ متشکل کر کے دکھا دیا جس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم تھا اور نہ ہی کوئی تن آسان دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا۔ اس طرح دنیا کو بتا دیا گیا کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ مسلمانوں نے کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کو ختم کر دیا اور قرآنی اصول پھر اپنی کائناتی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔

آپ سوچئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسان کے قدم نظام سرمایہ داری کی طرف اٹھے ہیں یا اس نظام معیشت کی طرف، جسے قرآن نے وجہ حریتِ انسانیت قرار دیا تھا آج اس باب میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج اس نظام کا غلغلہ ساری دنیا میں بلند ہو رہا ہے۔ کیا یہ اس امر کی زندہ شہادت نہیں کہ اسلامی نظام معیشت ہی آگے چلا ہے اور اسی میں یہ صلاحیت ہے کہ یہ عالمگیر انسانیت کے لئے حیات بخش نظام بن سکے؟ لیکن عقل کا تجرباتی طریق ابھی اس نظام کے مادی پیکر تک پہنچ سکا ہے۔ اس کی روح تک ہنوز اس کی رسائی نہیں پا سکا۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ نظام اوّل تو اپنی پہلی منزل ___ یعنی سوشلزم ___ میں ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ آخری منزل ___ کمیونزم ___ تک پہنچ ہی نہیں پایا۔ اور دوسرے، سوشلزم، بھی ہنگامہ آرائیوں اور فساد انگیزیوں کے جھکڑوں کے زور سے فضائے عالم پر چھا جانے کی کوشش میں مصروف ہے قلب و دماغ کے اطمینان سے زندگی کی بنیاد نہیں بن رہا۔ یہ اس لئے کہ اس قسم کے معاشی نظام کی بنیاد جس تصورِ حیات پر استوار ہوسکتی ہے وہ اس کی نگاہوں سے ہنوز اوجھل ہے۔ وہ بنیاد ہے مکافاتِ عمل اور حیات آخرت پر ایمان ___ وہ ایمان، جس کی بنا پر اس ذمہ داری کو قبول کرنے والے (عمرؓ فاروق) نے کہا تھا کہ:

''اگر (انسان تو ایک طرف) دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو خدا کی قسم، عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔''

''باز پرس'' کا اس قسم کا احساس، صرف حیاتِ آخرت کے ایمان سے پیدا ہوتا ہے، اور جب تک یہ احساس بیدار نہ ہو، یہ معاشی نظام کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ گوئٹے نے کس قدر بلیغ انداز میں کہا ہے کہ تسلسل حیات کے بغیر تو اس دنیا کی زندگی بھی زندگی کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔ میں کیوں نہ اس کے اپنے الفاظ (Quote) کر دوں۔ اس نے کہا ہے کہ:

That man is dead even in this life who has no belif in another.

سوشلزم، عقل کے تجرباتی طریق کا قدم اوّل ہے۔ اس کے عملی نفاذ کے بعد جب اس تجربہ میں مزید اضافہ ہوگا تو وہ اس بنیاد تک بھی پہنچ جائے گا جس کے بغیر یہ عمارت استوار نہیں ہوسکتی۔ اقبالؒ نے اسی حقیقت کے پیش نظر روس کے متعلق کہا تھا کہ:

فکر او در تند بادِ لا بماند مرکبِ خود را سوئے الا نراند

آیدش روزے کہ از زور جنوں خویش رازیں تند باد آید بروں

ترجمہ: اس کی فکر و تدبیر لا کی تیز آندھی میں پھنس کے رہ گئی۔ اس نے اپنی سواری کا رخ الا کی طرف نہ موڑا۔ ایک دن آئے گا جب وہ جنوں کے زور پر اپنے آپ کو اس تیز آندھی سے باہر نکال لے گا۔

اس لئے کہ:

در مقام لا نیاساید حیات سوئے الا می خرامد کائنات

ترجمہ: لا کے مقام پر زندگی آسودگی نہیں پاتی۔ کائنات خود بخود الا کی طرف چل نکلتی ہے۔

بنیادی حقوقِ انسانیت:

ہمارے زمانے میں بنیادی حقوق انسانیت (Fundamental Human Rights) کا بڑا چرچا ہے اور اقوام متحدہ (UNO) کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے ان حقوق کو متعین کر کے ان کا چارٹر شائع کر دیا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بنیادی حقوق کا تصور سب سے پہلے قرآن کریم نے دیا تھا اور انہیں نہایت وضاحت سے بیان بھی کر دیا تھا۔ قلت وقت کی بنا پر میں ان حقوق کی تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ اس لئے اجمالاً چند کے تذکرہ پر اکتفا کروں گا۔ دیکھئے قرآن کریم کی رو سے وہ حقوق کیا ہیں:

(1) تکریم آدمیت: یعنی ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں تکریم کا مستحق ہے۔

(2) جنسی مساوات: زندگی کے کسی شعبہ میں مرد اور عورت میں کوئی تفاوت نہیں۔

(3) مدارج کا تعین افراد کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی رو سے کیا جائے گا۔

(4) اطاعت صرف قانون کی ہوگی۔ اشخاص کی نہیں۔

(5) ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا حق ادا کیا جائے گا۔ اسے عدل کہا جاتا ہے اور جس شخص میں کوئی کمی ہوگی اس کی کمی پوری کی جائے گی۔ اسے احسان کہا جاتا ہے۔

(6) ہر شخص کو رزق (سامان زیست) مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی۔

(7) جان کی حفاظت کا حق۔

(8) جو چیز کسی کی ملکیت میں دی جائے اس کی حفاظت کا حق۔

(9) سکونت کا حق۔

(10) عصمت کی حفاظت۔

(11) شادی میں انتخاب کا حق۔

(12) حسن ذوق (Aesthetic Taste) کا حق۔

(13) مذہبی آزادی کا حق۔

(14) سچی بات کہنے کا حق۔

(15) مظلوم کو فریاد کا حق۔

(16) پرائیویسی کا حق۔

(17) حیثیت عرفی کے تحفظ کا حق۔

(18) اثبات جرم کے بغیر، ہر ایک کو بے گناہ تصور کئے جانے کا حق۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر حقوق کا تعین قرآن کریم نے اس زمانے میں کیا جب دنیا میں افراد کے حق کا تصور بھی کہیں نہیں تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کیا اس چودہ سو سال کے عرصہ میں، انسانی فکر نے ان حقوق کا تقاضا کیا ہے یا اس نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے! اور اگر اس نے ان حقوق کا مطالبہ کیا ہے تو کیا یہ اسلام کی کامیابی کی دلیل ہے یا اس کی ناکامی کا ثبوت؟ اسلام کی ناکامی تو ایک طرف، فکر انسانی اس باب میں بھی ہنوز اسلام سے پیچھے ہے۔ اسلام نے ان حقوق کو ابدی اور غیر متبدل قرار دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کا کوئی نظام ان میں تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس، اقوام متحدہ کے متعین کردہ حقوق کی کیفیت کیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ میں نے اس سے پہلے (Unesco) کے جس کمیشن کا ذکر کیا ہے اس نے، ان حقوق کے متعلق اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

> یہ حقیقت بدیہی ہے کہ یہ تمام حقوق بالآخر انسانی حقوق ہیں اور دیگر تمام انسانی حقوق کی طرح ایسے کہ ان پر حدود و قیود عائد کی جائیں اور انہیں قابل ترمیم و تبدل قرار دیا جائے۔ جبکہ جن حقوق کو بلا مشروط کہا جاتا ہے، ان میں بھی، ان حقوق کا مالک ہونے اور ان کے استعمال کا حق رکھنے میں بنیادی فرق ہے۔ ملکیت بجا ہے لیکن ان کا استعمال ان حدود اور پابندیوں کے مطابق ہوگا جو ان پر از روئے قانون عائد کی جائیں گی۔

اور ''از روئے قانون'' ان حقوق کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے اس کے لئے کسی شہادت کی ضرورت نہیں! یہی وجہ ہے کہ یونیسکو کے سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر (Quincy Wright) نے کہا تھا کہ:

> تجربہ نے بتایا ہے کہ اس باب میں کسی قوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر حال میں حقوق انسانیت کا احترام کرے گی۔ گذشتہ دنوں اقلیتوں پر جس قدر مظالم کئے گئے ہیں۔ ان سے انسانی ضمیر کانپ اٹھتا ہے۔

یہ اس لئے کہ دنیا کی ہر مملکت اپنے آپ کو اقتدار مطلق (ساورنٹی) کی مالک سمجھتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اگر ان حقوق کو پامال کر دے۔ تو اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس، قرآنی مملکت پر مستقل اقدار خداوندی کا کنٹرول ہوتا ہے اور وہ اپنے ہر فیصلہ اور عمل کے لئے قانونِ مکافات کی عدالت میں جوابدہ ہوتی ہے۔ فکر انسانی کا تجرباتی طریق ہنوز اس مقام تک نہیں پہنچا جس کی وجہ سے بنیادی حقوق کے چارٹر تو شائع ہو جاتے ہیں، ان پر

عملدرآمد کہیں نہیں ہوتا۔

مسلمان یونہی کہہ دیتے ہیں:

اس مقام پر، عزیزانِ من! میں ایک اور اعتراض کی طرف آنا ضروری سمجھتا ہوں۔ عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ عادت ہے کہ دنیا میں جہاں کوئی اچھا نظریہ سامنے آیا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ اسلام میں یہ پہلے ہی موجود ہے۔ جب دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہر صحیح نظریہ پہلے ہی سے اسلام کے اندر موجود ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام سے ان کی مراد کیا ہوتی ہے اور ان کی اس قسم کے دعویٰ کا ان کے پاس ثبوت کیا ہوتا ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں اور متعین اتھارٹی کی بنا پر کہتا ہوں۔ میری اتھارٹی قرآنِ کریم ہے جس کے متعلق ساری دنیا کو تسلیم ہے کہ وہ چودہ سو سال سے دنیا میں بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔ میں نے جو کچھ اس وقت کہا ہے (یا اس سے پہلے بھی جو کچھ کہتا چلا آ رہا ہوں) ان میں سے ایک ایک دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیات موجود ہے اور جب بھی کوئی طلب کرے انہیں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حقائقِ ابدی پر مدار ہے اس کا یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

غلط فہمی کی وجہ:

جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''اسلام آگے نہیں چلا'' جہاں تک میں نے غور کیا ہے، ان کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ وہ (ہم) مسلمانوں کو اور اسلام کو مرادف سمجھ لیتے ہیں اور اسی وجہ سے پوری جرات کے ساتھ کہہ دیتے ہیں کہ اگر اسلام میں فی الواقعہ ایسی صلاحیت موجود ہے جس کا دعویٰ کیا جاتا ہے تو پھر مسلمانوں کی حالت اس قدر پست کیوں ہے؟ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کا سکہ بند جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں تو اس کی صلاحیت موجود ہے لیکن ہم مسلمان اس پر کاربند نہیں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن جب وہ پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے جس پر کاربند نہ ہونے سے مسلمانوں کی یہ حالت ہو چکی ہے تو اس کا جواب اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ یہ نماز نہیں پڑھتے۔ روزے نہیں رکھتے، ان کی وضع قطع، تراش خراش سچے مسلمانوں جیسی نہیں۔ یہ شراب پیتے ہیں، فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جب معترضین یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ایسے مسلمان بھی تو ہیں جو نماز روزے کے بھی پابند ہیں اور فسق و فجور میں بھی مبتلا نہیں۔ پھر ان کی حالت بھی ویسی ہی کیوں ہے، تو اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔

یاد رکھیئے! جب تک ہم اس اعتراف اور اعلان کی جرات نہیں کرتے کہ ہمارا مروجہ اسلام وہ اسلام نہیں جسے خدا نے متعین کیا تھا۔ اس وقت تک ہم نہ ان اعتراضات کا کوئی اطمینان بخش جواب دے سکتے ہیں نہ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ اسلام، خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کے اندر محفوظ ہے۔ مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لینے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بڑے بڑے مشاہیر بھی، اسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یوں غیر شعوری طور پر مخالفین کے اعتراض کی تائید

وتقویت کا موجب بن جاتے ہیں۔ اسلام نے خدا کے ایک اور قرآن کے ایک ہونے کا لازمی نتیجہ، مسلمانوں کا ایک قوم ہونا قرار دیا ہے اگر خدا کی وحدانیت اور اس کی کتاب کی یکتائیت پر ایمان کے مدعی ہونے کے باوجود، یہ قوم امت واحدہ نہیں ہے جس میں، خدا اور قرآن پر ایمان کے دعویٰ کے باوجود، مسلمان مختلف قومیتوں میں تقسیم ہو رہے ہیں۔ قائداعظمؒ سے بھی یہ سوال کیا گیا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر اختلافات اور تفرقات ہیں۔ ان میں وحدت کی صورت کیا ہوگی، تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ یہ کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ جب ہمارا خدا ایک، رسول ایک اور قرآن ایک ہے تو ہم ایک اُمت کیوں نہیں بن سکیں گے۔ اس سے ان کا مطلب یہی تھا کہ جب ہم اپنی مملکت میں مستقل اقدار خداوندی کو بطور ضابطہ حیات نافذ کریں گے اور اس طرح مسلمانوں کو وحدت خداوندی کی عملی تعلیم دیں گے تو کیا وجہ ہے کہ ہم ایک اُمت نہیں بن سکیں گے۔ لہٰذا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایک خدا اور ایک قرآن کے ماننے کے باوجود مسلمانوں کی مختلف مملکتیں ہوسکتی ہیں، تو یہ ٹھیک ہے کہ جغرافیائی اور مقامی حالات کے تقاضوں کی رو سے، ایک سے زیادہ مملکتیں باقی رکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت محض انتظامی وحدتوں کی ہوگی۔ جب ان تمام مملکتوں کا ضابطہ حیات اور دستور ایک (یعنی قرآن) ہوگا تو ان میں باہمی اختلاف وافتراق کیسے ہوگا یہ ہوگی مختلف مملکتوں کی پوزیشن، وحدت خداوندی پر ایمان کی صورت میں۔ لیکن مروجہ اسلام میں تو حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کی مملکتیں سیکولر نظام کی مدعی ہیں اور اس کے باوجود وہ دعویٰ کرتے ہیں اور ہم اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور قرآن کی یکتائیت پر بھی۔ یاد رکھیئے! اگر خدا کی توحید پر ایمان کے دعویٰ کا نتیجہ اُمت کی وحدت نہیں تو قرآن کریم، خدا پر اس قسم کے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ آپ دنیا میں دیکھئے۔ چند دھریوں کو چھوڑ کر سارے انسان خدا کو مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں اس قدر اختلافات اور افتراقات ہیں۔ اگر محض خدا کو خدا، یا ایک خدا کو مان لینے سے وحدت انسانیت پیدا ہوسکتی تو پھر ان خدا پرستوں میں اس قدر اختلافات کیوں ہوتے؟ اور اگر آپ دنیا بھر کے خدا پرستوں کی بات نہ بھی کرنا چاہیں، تو صرف مسلمانوں کو لے لیجئے۔ ان کا تو ایک خدا پر ایمان ہے۔ پھر ان میں اس قدر اختلافات کیوں ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہم خدا پر ایمان لانے کے عملی مفہوم کو سمجھے ہی نہیں۔ دورِ حاضر کا عظیم سائنٹسٹ ایڈنگٹن، اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:

اصل سوال خدا کی ہستی پر اقرار کا نہیں بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔

(Science and the un-seen world)

لہٰذا، خدا کو ماننے کے معنی ہیں اس کی طرف سے نازل کردہ وحی کو ماننا۔ لیکن جس انداز سے ہم وحی (قرآن) کو مانتے ہیں، وہ بھی قرآن کا ماننا نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (2:8) وہ لوگ بھی ہیں جو اس کا دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتے۔ قرآن پر ایمان کے معنی کیا ہیں، اسے قرآنِ کریم ایسے واضح الفاظ میں بیان

کرتا ہے کہ اس کے بعد اس باب میں کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی وہ کہتا ہے کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44)

جو لوگ خدا کی نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہے کہ خدا پر ایمان کے معنی ہیں اس کتاب پر ایمان رکھنا اور اس کی کتاب پر ایمان کا عملی مفہوم ہے اس کے مطابق حکومت قائم کرنا، یہی کفر و ایمان کا معیار ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جن مملکتوں کا بنیادی ضابطہ قوانین ایک ہو، ان میں وحدت ہوگی یا نہیں! قرآن کریم نے ضابطۂ حیات کی وحدت کو صرف مسلمانوں میں وحدت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بتایا۔ اس نے کہا ہے کہ اس سے عالم انسانیت میں وحدت ہو جائے گی۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق (جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں) ایرک فروم نے کہا ہے کہ ''وہ مذہب منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا'' یہ ہے خدا کی توحید اور قرآن کی وحدت پر ایمان لانے کا حقیقی مفہوم۔ ہماری غلط نگہی، اور ہمیں دیکھ کر ان لوگوں کی بھی غلط نگہی جو اسلام کو ایک چلا ہوا کارتوس سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ ہم اسلام کو مذہب سمجھتے ہیں، اور مذاہب کے متعلق یہ حقیقت ہے کہ، کوئی ایک مذہب نہیں بلکہ سب مذاہب، چلے ہوئے کارتوس ہیں۔ پروفیسر (Hocking) کے الفاظ میں:

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادث زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینان خویش نے (جو درحقیقت فریب نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی) ان کے عقائد و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔
>
> (Living religions and a world faith)

لہٰذا جب تک اسلام کو مذاہب کی صف سے نکال کر، دین (ضابطہ حیات) کی حیثیت سے نہیں سمجھا جائے گا، اس کے زندہ جاوید ہونے کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکے گی۔ اسلام، مذہب کی چند رسوم کا مجموعہ نہیں۔ وہ زندگی کے غیر متبدل اصول و اقدار کا ضابطہ ہے۔ یہ غیر متبدل اصول قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں اور وہ برابر آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔

اسلام ہی غالب رہے گا

قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا نے الحق پر مبنی دین (نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (9:33) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظام حیات پر غالب آکر رہے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ تھی جس کے پیش نظر گوئٹے نے

(Eckermann) سے کہا تھا کہ:

اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکتے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطبات اقبالؒ)

میں نے اس مختصر سی نشست میں اسلامی نظام کے جس قدر اصول آپ کے سامنے پیش کئے ہیں، آپ سوچئے کہ کیا یہ حقیقت نہیں کہ رفتہ رفتہ وہی اصول، انسانوں کے خودساختہ اصولوں کی جگہ لے رہے ہیں! چونکہ یہ اصول ابدی ہیں اس لئے یہ بھی نہیں کہ انہوں نے کسی خاص زمانے میں تو اپنے انسانیت ساز نتائج مرتب کئے ہوں اور اس کے بعد یہ درخت سوکھ گیا ہو۔ ان اصولوں کے متعلق کہا یہ ہے کہ مثلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (14:24) ان کی مثال اس پھلدار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ (14:25) یہ شجر طیب ہر موسم میں پھل دیتا جائے گا۔ کبھی خشک نہیں ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں محتاج بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

نہ ہی یہ اصول یہودیت کی طرح کسی خاص نسل یا قوم کے اندر محدود و محصور رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ قرآن ذکر للعالمین ہے۔ یعنی تمام اقوام عالم کے لئے ضابطہ حیات۔ اگر کوئی قوم انہیں اپنانے کے بعد چھوڑ دے، تو یہ اصول معطل ہو کر نہیں رہ جاتے۔ انہیں جو قوم اپنا لے گی، ان کے خوشگوار نتائج سے بہرہ یاب ہوگی۔ اس نے خود مسلمانوں سے برملا کہہ دیا تھا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ (47:38) اگر تم نے ان سے منہ موڑ لیا تو تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے گی۔ اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم سے بہتر ہوگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

1۔ محفل ما بے مے و بے ساقی است ساز قرآں را نواہا باقی است
2۔ زخمۂ ما بے اثر افتد اگر آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
3۔ ذکر حق از امتاں آمد غنی از زمان و از مکاں آمد غنی
4۔ ذکر حق از ذکر ہر ذاکر جداست احتیاجِ روم و شام او را کجاست
5۔ حق اگر از پیش ما بر دارد ش پیش قومے دیگرے بگذارد ش

ترجمہ:

(1) ہماری محفل شراب اور ساقی کے بغیر ہے، مگر قرآن کے ساز کے نغمے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

(2) اگر ہماری مضراب میں کوئی اثر نہیں رہا تو آسمان کے پاس ہزاروں اور ساز ندے موجود ہیں۔

(3) خدا تعالیٰ کا ذکر قوموں سے بے نیاز ہے۔ وہ زمان اور مکان دونوں سے بے نیاز ہے۔

(4) ذکرِ حق ہر ذاکر کے ذکر کرنے سے الگ (اس کی اپنی الگ حیثیت ہے) اسے روم اور شام کی کیا حاجت ہے یعنی کوئی ضرورت نہیں۔

(5) اگر اللہ تعالیٰ اسے (قرآن کو) ہمارے سامنے سے اٹھالے تو وہ اسے کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا۔

یاد رکھئے! دنیا کی کوئی قوم نہ خدا کی چاہتی اولاد ہے، نہ سوتیلی۔ وہ رب العالمین ہے، تمام اقوام کا نشوونما دینے والا۔ اس لئے جو قوم بھی اس کے عطا کردہ اصولوں پر عمل پیرا ہوگی، ان کے نتائج سے بہریاب ہوجائے گی۔ جو انہیں چھوڑ دے گی ذلیل وخوار ہوجائے گی۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است اینجا قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

ترجمہ: یہ شراب خانہ ہے اور یہاں سب کو کھلی دعوت ہے یہاں پیالے کی استعداد دیکھ کر شراب بانٹی جاتی ہے (ہر شخص اپنے ظرف (حوصلہ) کے مطابق شراب (کامیابی) حاصل کرسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں مے نوشوں کو ان کے ظرف کے مطابق شراب دی جاتی تھی۔

حرفِ آخر:

جو کچھ میں نے آپ احباب کی خدمت میں پیش کیا ہے، آخر میں اسے چند ایک الفاظ میں دہرا دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں آپ کو جہاں جہاں انسانی صلاحیتوں کی نمود نظر آتی ہے۔ یہ صدقہ ہے خدا کی اس رحمت کا جسے اس نے تمام اقوام عالم کے لئے عام کردیا تھا۔ (وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (21:107)) دنیا، قرآنی اصولوں اور ان کی روشنی میں متشکل کردہ قرآن کے نظام کے کئی ایک گوشوں کو اپنا چکی ہے۔ بعض گوشوں کو اپنانے کی کوشش کررہی ہے اور باقی گوشے ایسے ہیں جنہیں یہ آگے چل کر اپنائے گی۔ اس لئے کہ ان کے بغیر نہ انسانی صلاحیتیں اپنی نشوارتقاء کی تکمیل تک پہنچ سکتی ہیں، نہ حسن کائنات میں نکھار پیدا ہوسکتا ہے۔ لہٰذا، بزم ہستی میں جہاں روشنی کی کوئی کرن نظر آتی ہے وہ اسی آفتاب عالمتاب کی ضیا باریوں کا صدقہ ہے اور گلشنِ عالم میں جہاں کوئی پھول کھلتا دکھائی دیتا ہے وہ اسی جان بہار کی نگہت پاشیوں کا رہین منت ہے۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ است

ترجمہ: (اے زندہ رود) تو جہاں کہیں رنگ و بو کی دنیا دیکھتا ہے اور ہر وہ جہان جس کی خاک سے آرزو پھوٹتی ہے یعنی پیدا ہوتی ہے۔ یا تو اس کی قدر و قیمت حضرت محمد ﷺ کے نور سے ہے یا پھر ابھی تک وہ مصطفیٰ ﷺ کی تلاش میں ہے۔ یعنی اس فضا میں جتنے بھی اور جہان ہیں وہ یا تو حضور اکرم ﷺ کے نور سے منور ہو چکے ہیں یا اگر ابھی تک کوئی جہان اس نعمت سے محروم ہے تو وہ اس نورِ مبارک کی تلاش میں ہے تاکہ وہ مکمل اور بامقصد ہوجائے۔ (غلام احمد پرویزؒ)

(مطبوعہ طلوعِ اسلام، فروری 1973ء)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیا ہر شخص پارلیمنٹ کو جوابدہ ہے؟

پاکستان قومی اسمبلی کے اکیٹنگ سپیکر جناب قاسم خاں سوری کا ایک بیان، 4 جنوری 2019ء کے اخبارات میں طبع ہوا ہے۔ ہم نے یہ بیان ''دی نیوز'' میں پڑھا ہے۔ اس بیان میں جناب سوری صاحب نے ارشاد فرمایا: ''Everyone is answerable to parliament'' ہر شخص پارلیمنٹ کو جوابدہ ہے۔ ہم ذاتی طور پر جناب سوری صاحب سے واقف نہیں ہیں۔ صرف اخبارات میں ان کا نام اور ان کے بیانات البتہ پڑھتے رہے ہیں۔ ان کے اس بیان سے بھی ہمیں ذاتی طور پر کوئی لینا دینا نہیں۔ تحریک طلوعِ اسلام ایک خالص علمی، قرآنی تحریک ہے۔ یہ تحریک دین کی داعی ہے اور قرآنِ خالص کے نظریات کی نشر و اشاعت کرتی ہے اس کا سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقے سے کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ جو بیانات یا جو نظریات قرآنِ کریم کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ تحریک صرف ان کی نشاندہی کر دیتی ہے اس تحریک کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ کوئی شخص یا کوئی ادارہ اس نشاندہی کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ جناب سوری صاحب کے اس بیان پر بھی یہ تحریک ان کے ذاتی خیال پر تبصرہ نہیں کر رہی ہے بلکہ ایک اصول پیشِ نظر ہے کہ کیا قومی اسمبلی کی یہ پوزیشن ہے کہ ہر شخص اس کو جوابدہ ہو۔

قومی اسمبلی تو ایک مجرد تصور ہے۔ یہ اسمبلی اپنے ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ ارکان کی پوزیشن سے اس کی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ اس اسمبلی کے ارکان کے حالات سب کے سامنے ہیں۔ وہ خود ایک دوسرے کو چور، ڈاکو، لٹیرے کہتے ہیں اور بالکل بجا کہتے ہیں۔ اکثر ارکان کمزور سیرت کے حامل ہیں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا ان کی سیرت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تحریر تو ان کے بیان پر ایک اصولی تبصرہ پیش کر رہی ہے۔

قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے (30:32) اور اس کے نزدیک مذہب اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں۔ اس کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جس طرح فرقہ بندی شرک ہے۔ اسی طرح سیاسی پارٹیاں بنانا بھی شرک ہے۔ فرقہ بنانے والوں کا رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں رہتا (6:159)۔

قرآنِ کریم نے فرعونی سیاست کو کئی مقامات پر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم بہت مختصر طور پر اس کو یہاں بیان کرتے ہیں۔ فرعون کی قوم کی تعداد بہت کم تھی اور وہ قبطی کہلاتے تھے اور جو محکوم قوم تھی وہ بنی اسرائیل تھے ان کی وہاں اکثریت تھی اور

یہ سبطی کہلاتے تھے۔ اس فرعون کا حکومت کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (28:4)، اس نے اپنی حکومت کو چلانے کے لئے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ان میں سے ایک پارٹی (بنی اسرائیل) کو کمزور تر کرتا چلا جا رہا تھا اس کے لئے اس کی پالیسی یہ تھی کہ وہ اس قوم کے ان افراد کو جن میں اُسے جوہر مردانگی نظر آتے تھے، ذلیل وخوار کر کے غیر موثر بنا دیتا اور جو ان جوہروں سے خالی ہوتے تھے اُنہیں ابھارتا اور آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ اس طرح وہ اس قوم کے اندر ناہمواریاں پیدا کر کے ان کی قوت کو توڑتا چلا جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے فرعونی سیاست کے متعلق جو کچھ تذکرہ کیا ہے وہ ایسے ابدی حقائق ہیں کہ ان اصولوں کو ہر دور میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اپنے ملک کے سابقہ حالات دیکھ لیں کہ اس طرح ہمارے فوجی ڈکٹیٹروں نے کمزور سیرت، بزدل لیڈروں کو ان کی پارٹیوں سے توڑا اور کس طرح ہمارے سیاسی لیڈروں کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ مغربی جمہوریت اور مغربی جمہوری سسٹم جس میں قرآنی مستقل اقدار پیش نظر نہ ہوں قرآنِ کریم کے نزدیک شرک پر مبنی ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اس اسمبلی کی پوزیشن اور اس کی حیثیت اس درجہ واضح ہے کہ ہمیں اس کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سورۂ مائدہ میں ارشادِ عالی ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)، وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (5:45)، وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (5:47) جو ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ ان آیات کریمات کا اطلاق تمام مسلمان پاکستانیوں پر ہوتا ہے، عوام میں سے تو کوئی قانون سازی نہیں کرتا۔ لیکن قومی اسمبلی کا تو اولین کام ہی قانون سازی ہے۔ اس اسمبلی کے ارکان پر تو براہِ راست، سب سے پہلے ان آیات کا اطلاق ہوتا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم، نے ان آیات کی تشریح اپنی تفسیر قرآن ''تفہیم القرآن'' میں خوب کی ہے۔ ہم خود اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ آپ ان کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔۔ وہ تحریر فرماتے ہیں: ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کا حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی واطاعت کے دائرے سے باہر قدم

نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر اور ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکمِ خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں ممکن نہیں کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہو۔''

(تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص:475)

اسی تفسیر میں سورۂ البقرہ کی آیۂ کریمہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا (2:165)، ترجمہ: کچھ لوگ ایسے (بھی) ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِ مقابل بناتے ہیں کہ ذیل میں مولانا مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔ ''اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں۔ اسی کے آگے اعتراف بندگی میں سر جھکائیں اُسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رجوع کریں اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں۔ اس کے حکم کو منبع قانون مانیں۔ اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کن قرار دیں۔ اور ہدایت و رہنمائی کے لئے اسی کی طرف رجوع کریں۔ جو شخص خدا کی ان صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کے (خدا کے) ان حقوق میں سے کوئی ایک حق بھی کسی دوسرے کو دیتا ہے وہ دراصل اسے خدا کا مدِ مقابل اور ہمسر بناتا ہے اور اسی طرح جو شخص یا جو ادارہ ان صفات میں سے کسی صفت کا مدعی ہو اور ان حقوق میں سے کسی حق کا انسانوں سے مطالبہ کرتا ہو وہ بھی دراصل خدا کا مدِ مقابل بنتا ہے خواہ زبان سے خدائی کا دعوٰی کرے یا نہ کرے۔

سورۂ النساء میں ایک آیۂ کریمہ ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (4:100)

ترجمہ: جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ، اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے گا، پھر راستہ میں ہی اُسے موت آجائے تو (اس کا بھی) اجر اللہ کے ذمہ واجب ہو گیا۔ اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔

اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کے ذیل میں حضرت مولانا مرحوم تحریر کرتے ہیں ''یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو، اس کے لئے نظامِ کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظامِ کفر کو نظامِ اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء کرامؑ اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت اور بیزاری کے ساتھ وہاں مجبوراً قیام رکھتا ہو، اور ان دو صورتوں کے علاوہ ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے۔''

(تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص:387)

مولانا مرحوم اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ اسلامی نظام کا قائم کرنا نہایت ضروری ہے اور غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے۔ غیر اسلامی نظام کے لیڈروں اور ان کی قومی اسمبلی میں وضع کردہ غیر قرآنی قوانین کی اطاعت ایک مسلسل معصیتِ خداوندی ہے۔ قرآنِ کریم اور مولانا کے نزدیک اسلامی نظام کے لیڈروں کی اطاعت جرم ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کو اکابر مجرمین یعنی مجرموں کا سردار کہا ہے۔ قرآن کے نزدیک جو لوگ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے (4:97) قرآن کریم کی آیات اور مولانا کے اقتباسات آگے آتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حضرات پاکستان کو اسلامی مملکت خیال کرتے ہوں۔ اس لئے ہم اسلامی مملکت یا ریاستِ مدینہ کی تعریف (Definition) عرض کریں گے۔

اسی موقف پر اصرار کرتے ہوئے مولانا مزید ارشاد فرماتے ہیں: ''مسلمان کو جو چیز کافر سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اس کے رب نے اُسے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدائی سند کا اپنے آپ کو حاجت مند سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول (علیہ السلام) کی طرف رجوع کرتا ہے پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اس صورت میں آزادیٔ عمل برتتا ہے اور اس کی یہ آزادیٔ عمل اس حجت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا کوئی حکم نہ رہنا اس کی طرف سے آزادیٔ عمل عطا کئے جانے کی دلیل ہے۔

قومی اسمبلی میں قانون وضع کرنے، اور ان کو نافذ کرنے والے لیڈروں اور حکام کے متعلق مولانا سورۃ النساء کا حوالہ دیتے ہیں ارشاد حضرت باری تعالیٰ سبحانہٗ ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ (4:60)

ترجمہ: اے نبی (ﷺ) تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ اُنہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مولانا نے اس آیۂ کریمہ کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''یہاں صریح طور پر ''طاغوت'' سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو۔ لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت ''طاغوت'' کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لئے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم

وملزوم ہیں اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافعت ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں کہ مولانا کیسے واضح طور پر قومی اسمبلی کی پوزیشن اور اس کی حیثیت کو Condemn کر رہے ہیں۔ وہ اس رویہ کو گاندھی جی بھی خوش رہیں، راضی رہے سرکار بھی کے مانند قرار دے رہے ہیں۔

سورۃ الشوریٰ کی آیۂ کریمہ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ (42:13) کی تفسیر کرتے ہوئے پھر اقامت دین کی فرضیت اور اس کے وجوب پر اصرار کیا ہے۔ یہ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن موضوع کی منافقت سے اس کی ایک اہمیت ہے۔ ہم قارئین کرام سے معذرت کے بعد اس کو تحریر کرتے ہیں۔ ارشاد ہے ''قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کے پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت سے مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے۔ بلکہ یہ اعلانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیروؤں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی، قانونی اور سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کئے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط (4:105) اے نبی ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی تا کہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس روشنی میں جو اللہ نے تم کو دکھائی۔'' اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقررہ قانون کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (9:60) اس کتاب میں سود کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سود خواری جاری رکھے والوں کے خلاف جو اعلان جنگ کیا ہے وہ اسی صورت میں روبعمل آ سکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھوں میں ہو۔ اس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (2:178) چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (5:38)، زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (24:2)، اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت دینا ہوگا۔ اس کتاب میں کفار سے قتال کا حکم (2:190)، یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اس کتاب میں اہل کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (91:29)، اس مفروضہ پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے ان سے جزیہ وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے اور یہ معاملہ مدنی سورتوں تک ہی محدود نہیں۔ مکی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو اعلانیہ یہ نظر آتا ہے کہ ابتداء ہی سے جو نقشہ پیش نظر تھا وہ دین کا غلبہ و اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہل دین کے رعیت بن کے رہنے کا۔''

قومی اسمبلی اور اس کے ارکان کی حیثیت کے متعلق کچھ تحریر کرنا بڑا نازک معاملہ ہے۔ اسی لئے ہم نے اپنے اس مضمون میں اپنی طرف سے بہت کم لکھا ہے۔ مولانا مودودی مرحوم کے وہ اقتباسات پیش کئے ہیں جن سے اسلامی نظام کی اہمیت اور

کفر کے نظام سے نفرت سامنے آتی ہے۔ ان کے ان اقتباسات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کے نزدیک قومی اسمبلی اور اس کے ارکان کی کیا حیثیت ہے۔

اس اہم موضوع پر اپنے مضمون کو مزید مضبوط کرنے کے لئے ہم چند مزید اقتباسات پیش خدمت عالی کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی کا ماہانہ رسالہ ترجمان القرآن کے شمارہ دسمبر 2011ء میں ایک بہت عمدہ مضمون بعنوان ''اقامت دین فرض ہے۔'' طبع ہوا تھا ہم نے اس مضمون پر اپنا تبصرہ تحریر کیا تھا جو رسالہ طلوعِ اسلام کے شمارہ فروری 2012ء میں طبع ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس رسالہ ترجمان القرآن کا وہ شمارہ نہیں ہے۔ ہم اپنے مضمون سے وہ اقتباسات لے رہے ہیں جو ترجمان القرآن کے مضمون میں طبع ہوئے تھے ملاحظہ فرمائیں۔

1۔ اقامت دین تمام فقہائے اسلام کے نزدیک متفقہ اور مسلمہ فریضہ ہے اس میں اختلاف وتفرقہ حرام ہے۔ جس طرح دین کی تبلیغ ہماری ذمہ داری ہے۔ دین کے احکامات پر انفرادی اور اجتماعی طور پر عمل درآمد بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داریاں ہم نے ازخود نہیں لیں بلکہ رب کائنات جس نے ہمیں عدم سے وجود بخشا وہ ہمارا مالک اور حقیقی ولی ہے۔ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ انسانی پیدائش کا مقصد بتائے اور اس کے لئے ضابطۂ قانون بتائے۔ اس نے ہمیں انبیاء (علیہم السلام) کا وارث قرار دیا ہے۔ اس نے انبیاء (علیہم السلام) کی بعثت کا مقصد اقامتِ دین کو قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ فریضہ اُمت مسلمہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس طرح ازخود اقامت دین ہماری زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ مقصد زندگی قرار دینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے مقصد زندگی کا صحیح شعور حاصل کریں اور اس کے مطابق اپنے اندر مطلوبہ اخلاق واوصاف اور استعداد پیدا کریں۔''

2۔ ایسے تمام نصوصِ قرآنی سے بطورِ اقتضاء، اسلامی حکومت کے قیام کی فرضیت ثابت ہے اور مسلم معاشرے کے تمام افراد پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرنا تاحد استطاعت فرض ہے اور استطاعت کے باوجود اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا ویسے گناہ اور معصیت ہے جیسے صاحبِ استطاعت مسلمان پر روزہ، نماز، زکوٰۃ، حج فرض ہے اور ان فرائض کو ترک کرنا عاقبت کو برباد کرنا ہے۔

3۔ حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے اور اگر ایسی نہیں تو اس کی اطاعت جرم ہے۔

4۔ مومن وہ ہے جو قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطۂ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظامِ الٰہی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظامِ الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس (مومن) کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو اکھیڑ پھینک کر، اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور اس کے نظام

کو جاری کر دے اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ کے باغی، عادی اور نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی روزہ نماز کے پابند ہوں۔ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:128) اس کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97) اور غیر اسلامی نظام میں جس قدر رزق حاصل ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہوتا ہے۔ اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہے۔ کیونکہ اس کی تقسیم قانونِ خداوندی کے مطابق نہیں ہوتی۔''

جناب نے مندرجہ بالا چاروں اقتباسات ملاحظہ فرمائے۔ یہ اقتباسات پر آپ نے خیال فرمایا ہوگا کہ یہ اقتباسات رسالہ طلوعِ اسلام سے ماخوذ ہوں گے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ان اقتباسات میں سے پہلے دو اقتباسات موقر رسالہ ترجمان القرآن بابت دسمبر 2011ء کے ہیں۔ جس میں ایک مضمون بعنوان اقامت دین فرض ہے۔'' میں طبع ہوا تھا۔ یہ مضمون نہایت جامع اور اپنے عنوان کی نسبت سے عمدہ تھا۔ تیسرا اقتباس مولانا مودودی صاحب کی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' سے لیا گیا ہے اور چوتھا اقتباس ہمارے اپنے مضمون سے لیا گیا ہے جو رسالہ طلوعِ اسلام میں طبع ہوا تھا۔ تین اقتباسات جماعت اسلامی کی فکر کے اور چوتھا اقتباس تحریکِ طلوعِ اسلام کی فکر کا عکاس ہے۔ ان دونوں تحریکوں کا اقامتِ دین کے فرض اور واجب ہونے پر مکمل اتفاق ہے۔ مگر ایک فرق کے ساتھ۔ مودودی مرحوم کے افکار کی رو سے انجامِ کار مذہبی پیشوائیت کے ایک بھیانک طرزِ حکومت کا تصور وجود میں آتا ہے جبکہ طلوعِ اسلام صرف اور صرف خالص قرآنی اصول و اقدار پر مبنی حسین طرزِ معاشرت کا داعی ہے۔ قرآن کی رو سے مذہبی پیشوائیت پر مبنی حکومت بدترین حکومت ہوتی ہے۔

قرآنِ کریم نے طاغوتی نظام کے لیڈروں کے متعلق متعدد مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ جہنم میں لیڈروں اور عوام کے درمیان جو مکالمے ہوں گے ان کا بھی بار بار حوالہ دیا ہے (33-31:34، 33-27:37، 48-40:47، 26:95، 41:29، 38-7:39، 38:60) ہم وہ مکالمات تحریر نہیں کرتے کیونکہ ان سے مضمون مزید طویل ہو جائے گا۔ ہم نے ان کے حوالہ دے دیئے ہیں۔ جو حضرات ان سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ حوالہ ملاحظہ فرمائیں۔ لیکن آخر میں ایک آیت کا حوالہ دینا البتہ ضروری سمجھتے ہیں جس میں قرآن نے لیڈروں کو ''اکابر مجرمین'' مجرموں کا سردار کہا ہے ارشادِ عالی ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ (6:123) ترجمہ: ''اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے قصور والوں کو سردار بنایا تا کہ ان میں مکاری کیا کریں اور وہ لوگ جو بھی مکاری کرتے ہیں، اپنے ہی حق میں بُرا کرتے ہیں اور سمجھتے تک نہیں۔''

قرآنِ کریم سلب و نہب اور ظلم و استبداد پر مبنی نظام کے اربابِ حل و عقد کو اکابر مجرمین کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کی رُو سے مجرم تو اس نظام کے سارے افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے اکابر مجرمین (اربابِ اقتدار) لیڈر ہوتے ہیں۔ جب حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی اصلاح کے لئے مامور کیا گیا تو انہوں نے بحضور رب العزت گذارش کی کہ بارالٰہا وہ قوم اس

قدر کثیر التعداد ہے اور ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے اس کی اصلاح کس طرح ممکن ہوگی تو جواب ملا کہ وہ قوم بیشک ساری کی ساری بگڑی ہوئی ہے لیکن وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (27:48)، اس مملکت کے دارالسلطنت میں نو صاحبِ اقتدار ہیں جو سارے فساد کی جڑ ہیں۔ ان کے بگڑنے سے ساری قوم بگڑ رہی ہے۔ ان کی اصلاح ہو جائے تو ساری قوم سنور جائے گی۔

قرآن کریم کی رُو سے، قوموں کے بگاڑ اور اصلاح کے سلسلہ میں ان اربابِ اقتدار اور لیڈروں کی ذمہ داری بنیادی ہوتی ہے، یہی ہیں جو کاروانِ قوم کو، (قرآن کے الفاظ میں) اس منڈی میں لا اتارتے ہیں جہاں اس جنس کا سدا کوئی خریدار نہیں ہوتا (14:28)، لیکن وہ قرآن متبعین (Followers) کو بھی بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ وہ اسے کہتا ہے کہ تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم آنکھیں بند کر کے دوسروں کے پیچھے چلتے جاؤ۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لیتے اور تباہی اور بربادی کے راستے پر ان کے پیچھے نہ لگتے۔ ان لیڈروں اور ارباب اقتدار کی اپنی قوت کچھ نہیں تھی۔ تم ان کی تقویت کے سامان بنے تو انہوں نے اس قدر تباہیاں مچا دیں۔ تم پر یہ حکومت بھی اس لئے کرتے رہے تھے کہ تم ان کے سامنے جھکے رہے۔ اگر تم کھڑے ہو جاتے تو یہ خود ہی بے دست پا ہو جاتے ہیں۔

(مطالب الفرقان)

ہم نے اپنے اس مضمون کے شروع میں وعدہ کیا تھا کہ ہم اسلامی مملکت کی تعریف Definition بھی عرض کریں گے۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مملکت اس وقت اسلامی ہوتی ہے جب اس میں صرف قرآن میں دی گئی مستقل اقدار کا نفاذ ہوتا ہے اور اس مملکت کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے، پھر اس مملکت میں خدا پرستی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اگر آپ قومی اسمبلی اور اس کے ارکان کو عزت کا مقام دینا چاہتے ہیں تو آپ اس اسمبلی میں قرآنی مستقل اقدار، اور ان پر مبنی جزئیات جاری کریں۔ اسمبلی کے تمام ارکان مستقل اقدار پر عمل کریں۔ صفات خداوندی کو اپنے میں پیدا کریں اور ان کے مطابق عمل کریں۔ پھر بے شک یہ اسمبلی اس قابل ہوگی ہر شخص اس کی عزت کرنے کا خواہاں ہوگا۔ اس کے احکامات کی اطاعت گویا عبادتِ خداوندی ہوگی۔ اسلامی قوانین کو جاری کرنے کے اداروں کو قرآن نے مساجد اللہ کہا ہے۔ (72:18) پھر یہ اسمبلی بھی مسجدِ خداوندی ہوگی۔ اس کا شمار شعائر اللہ میں ہوگا۔ اس کے ارکان حاملین عرش الٰہی ہوں گے (39:75) اور یہ ریاست مدینہ کہلانے کی مستحق ہوگی۔

جہاں تک موجودہ اسمبلی کے ارکان ہیں ان کی خدمت عالی میں ہماری درخواست ہے کہ انہیں قرآن کریم کے آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر اپنا مقام ضرور متعین کرنا چاہئے۔ یہ ان کے لئے بہت سودمند ہوگا۔

لگایا آئینہ یہ کہہ کے اس نے روزنِ در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق
ذاتی مشیر، منفرد مفکرِ قرآن و بانی تحریک طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ

علامہ غلام احمد پرویز کی تصنیفات 2019

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)		2500
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد۔ دو جلدوں میں)		2800
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	Out Of Print	
تبویب القرآن (مجلّد)		2000
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ ـــــ سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر)	2500	5000
مطالب الفرقان (جلد اول)	350	700
مطالب الفرقان (جلد دوم)	350	700
مطالب الفرقان (جلد سوم)	350	700
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	350	700
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	400	800
مطالب الفرقان (جلد ششم)	350	700
مطالب الفرقان (جلد ہفتم)	350	700
من و یزداں (اللہ کا صحیح تصور)	350	700
اِبلیس و آدم	350	700
جُوئے نور	350	700
برقِ طور (داستانِ حضرت موسیٰؑ)	350	700
شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰؑ کی داستان)	350	700
معراجِ انسانیت (سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ)	400	800

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	300	600
انسان نے کیا سوچا؟	350	700
اِسلام کیا ہے؟	300	600
کتاب التقدیر	350	700
جہانِ فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)	350	700
شاہکارِ رسالت (سیرتِ فاروقِ اعظمؓ)	400	800
نظامِ ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)	350	700
تصوف کی حقیقت	350	700
قرآنی قوانین	300	600
سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	300	600
سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)	300	600
سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)	300	600
طاہرہ کے نام خطوط	300	600
ختمِ نبوت اور تحریکِ ''احمدیت''	200	400
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ)	*	200
اقبالؒ اور قرآن (اول۔ دوم)	400	800
مجلسِ اقبالؒ۔ اول (شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی)	400	800
مجلسِ اقبالؒ۔ دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...)	*	300
قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان (مجموعۂ مقالات و خطبات)	300	600
بہارِ نو (مجموعۂ مقالات و خطبات)	300	600

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
ISLAM: A Challenge to Religion	400	800
Exposition of the Holy Quran	*	2500
The Book Of Destiny	400	800
Reasons for Decline of Muslims	*	400
Islamic Way of Living	200	400
Letters to Tahira	*	600
Quranic Laws	*	600
The Quranic System of Sustenance	*	800
Did Quaid-e-Azam Want to Make Pakistan a Secular State?	*	250
اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام وہدایات)	200	400
اسبابِ زوالِ امت	150	300
جہاد (جہاد کے متعلق قرآنِ کریم کے احکامات)	*	200
خدااور سرمایہ دار (مجموعہ مقالات وخطبات)	250	500
سلسبیل (مجموعہ مقالات وخطبات)	300	600
فردوسِ گم گشتہ (مجموعہ مقالات وخطبات)	300	600

متفرق کتب

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مقامِ حدیث	250	500
قرآنی فیصلے (جلد اول)	400	800
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	400	800
قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	*	200
مزاج شناسِ رسول	200	400
تحریکِ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	350	700
The Best Of A.S.K. Joommal	*	600
The Pakistan Idea	*	300
Woman - Recreated	*	300
The Bible - Word of God or Word of Man	*	400
The Holy Quran and our Daily Life	*	400

کتابیں ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25-بی، گلبرگ 2، لاہور
فون نمبر: 35753666
trust@toluislam.com
www.toluislam.com

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 01720041073503، حبیب بینک لمیٹڈ، مین مارکیٹ گلبرگ برانچ، لاہور۔

ان قیمتوں میں ڈاک خرچ اور پیکنگ کا خرچہ شامل نہیں۔ یہ قیمتیں کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 24)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

جان ڈیوی کے نظریہ نتائجیت کی وضاحت:

ڈیوی کا نظریہ عملیت ایک تو ان شرائط کو بیان کرتا ہے جن پر استدلال موقوف ہے اور دوسری طرف اس عمل کو جس کی بدولت ان نتائج کا علم حاصل ہوتا ہے جو فکر یا استدلال کے کسی مخصوص حالات میں برآمد ہوتے ہیں۔

ڈیوی اگرچہ سائنسی تحقیق اور اخلاقی یا سماجی تحقیق کے درمیان فرق کرتا ہے۔ لیکن دونوں علوم کی ریسرچ کو طریق کار میں یہی اصول دیتا ہے کہ

1۔ یہ تحقیق اس لیے شروع ہوتی ہے کہ کسی مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا حل نہیں سوجھتا اور فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو مسئلہ کا پوری گہرائی سے جائزہ لے کر اسے سمجھنا چاہیے۔

2۔ مسئلہ کے سمجھنے میں تسلی ہو جائے تو اس کے متعلق جو لٹریچر بھی دستیاب ہو سکے، اس کو حاصل کر کے۔ ان سب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے علم حاصل ہو جائے گا کہ اس مسئلہ پر اب تک کیا تحقیق ہو چکی ہے اور کتنی ابھی باقی ہے۔

3۔ تحقیق کا مواد اکٹھا کر کے اس مواد اور اس کے نتائج کی روشنی کی الگ الگ جماعت بندی کا اہتمام کرنا چاہیے۔

4۔ جماعت بندی کی مشق کے بعد مسئلہ کے ممکن حل کے متعلق کوئی مفروضہ یا مفروضے بنانے چاہئیں۔

5۔ مفروضوں سے شرطیہ جملے بنیں گے یعنی اگر یہ مفروضہ یا مفروضے ٹھیک ہوں گے تو کیا کیا نتائج نکلیں گے۔ یہاں منطق اور ریاضیات کی ضرورت بھی پڑے گی۔

6۔ ان شرطیہ جملوں کو ٹسٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ آیا ان سے نتائج نکلتے ہیں۔ حل کا ذکر شرطیہ جملوں میں آتا ہے۔ اگر مفروضے اس معیار پر پورے اترتے ہیں تو ٹھیک ہیں اور یہی ان کا قابلِ قبول ہونے کا معیار کہلاتے ہیں۔ دوسری صورت میں وہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔ اس ضمن میں مشاہدہ اور تجربہ دونوں سے کام لینا ہوگا۔ ڈیوی کے مطابق فکر کا کام صورتِ حال کا جائزہ لینا ہے جو مفروضوں کے نتائج کے حوالوں سے ہوتا ہے۔ لہٰذا خواہ مسئلہ سائنسی ہو یا اخلاقی دونوں

صورتوں میں نتائج اور ثمرات کو دیکھنا ہوگا۔

نظریہ تجربیت اور اُس کی ذیلی شاخوں نظریہ منطقی اثباتیت اور نظریہ نتائجیت کا جائزہ لینے کے بعد اب ہم فہمِ علم کی دوسری بنیادی اور اساسی نظریہ تصوریت/عقلیت پر اظہارِ خیال کرنے کی پوزیشن میں آ گئے ہیں۔

2۔ نظریہ تصوریت/عقلیت:

تصوریت کی ایک جامع تعریف بیان کرنا جو اس کی مختلف صورتوں کو محیط ہو خاصا مشکل کام ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تصوریت، ہمیشہ مادیت کے خلاف سمجھی جاتی رہی ہے اور مادہ حرکت و توانائی کے تصورات سے اصولاً اختلاف کرتے ہوئے حیات و زندگی اور نفس و شعور کی عملداری کی داعی رہی ہے۔

تصوریتی مدرسہ فکر کے دو رُخ، سلبی اور ایجابی میں تمیز کی جا سکتی ہے۔ سلبی نقطۂ نظر سے تصوریت کے مطابق مادی دنیا اپنی حقیقت میں وہ نہیں جیسی نظر آتی ہے اور ایجابی نقطۂ نظر سے حقیقت کا مدار نفس پر ہے۔ تصوریت کے ان دو پہلوؤں سے تصوریت کے دو نظام علمیاتی اور مابعد الطبیعاتی سامنے آتے ہیں۔ علمیاتی تصوریت میں نمایاں نام جارج برکلے کا ہے جس کے مطابق ہستی کا انحصار اس کے علم پر ہے۔

بریڈلے کے مطابق حقیقت کا مسلۂ تضادات سے پرے اور جُزیات سے افضل ہے۔ وہ جُزیات کو بھی تناقضات کا نام دیتا ہے۔ زمان، مکان، صداقت، اضافات سبھی تناقص میں شامل ہوتے ہیں، لہٰذا مجازی ہیں اور حقیقی نہیں ہیں۔ حقیقی اور مُطلق وہ ہے جہاں تناقضات اور امتیازات سے پردہ اُٹھ جاتا ہے۔

مابعد الطبیعاتی کے سلسلے میں افلاطون اور ہیگل کے نام نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

مابعد الطبیعاتی تصوریت کے نظریہ میں دلائل کا آغاز مُسلمات کو فرض کرنے سے ہوتا ہے جس سے نظریہ تجربیت کے برعکس مراد منطقی یا استخراجی نظام میں ایک ایسا قضیہ جو بلا ثبوت بطور مُسلمات تسلیم کیا جائے یا اس نظام کی تشکیل کی حد تک قبول کیا جائے۔ یعنی یہ ایک ایسا قضیہ ہے جس کی صداقت بلا ثبوت تسلیم کی جائے اور ایک استخراجی نظام میں متوافق طور پر اس سے دوسرے قضایا کا اشتقاق کرنے کا نام دیا جاتا ہے۔ اِن میں مسلمات سے مراد وہ حقائق اور تصدیقات ہیں جن کی صحت و صداقت حسّی تجربے سے آزاد ہو۔ جو وجوبی اور کُلی صداقت کے حامل ہوں۔ یعنی کُلی، وجوبی، تجربہ سے آزاد بیان جو تجربہ پر مبنی نہ ہو لیکن تجربہ پر صادق آئے۔

نظریہ تصوریت کا خیال ہے کہ علم کی دنیا کا ذریعہ عقلیت ہے جس سے مفہوم یہ ہے کہ ہمیں بعض اصولوں کو بطور مسلمات تسلیم کرنا پڑتا ہے اور پھر ان مسلمات کی روشنی میں حواس کے ذریعے حاصل شدہ معلومات سے نتائج اخذ کرنے ہوتے ہیں جب تک ان مسلمات کو بطور معتقدانہ نہ مانا جائے۔ سائنس کا علم آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

بعض اصولوں کو بطور مسلمات تسلیم کرنے سے عموماً حکمائے مغرب ان کو بلا سند قرار دیتے ہوئے اس پر شدید تنقید بھی کرتے ہیں۔ خصوصی طور پر اہل تجارب و مشاہدات ان معتقدات کے قائل نہیں ان کے نزدیک علم کی بنیاد یکسر مشاہدات و

تجارب ہیں۔

مُسلمات کی ضرورت:

نظریہ تجربیت کی تنقید کی البتہ راشدل نے بھرپور طریقے سے تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں دوسروں کی راہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر علم وفن کے چند مبادی اصول وقواعد ہوتے ہیں (جنہیں maxims یا Postulates یعنی مسلمات کہا جاتا ہے)۔ اگر ہم اس علم وفن کے شروع کرنے سے پہلے ہی یہ تقاضا کریں کہ جب تک وہ بنیادی اصول وقواعد سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ ہم میں سے السابقونَ الاولون اپنے اعمال سے اس علم کی جانچ کے لئے ابتداء نہیں کریں گے تو ہم قیامت تک اس علم کو حاصل نہیں کر سکتے۔ تیرنا تب ہی آئے گا جب السابقونَ الاولون میں سے کوئی پانی میں اتر جائیگا۔ کنارے پر کھڑے رہ کر انتظار کرتے رہنے سے تیرنا نہیں آ سکتا۔ جب آپ اس طرح کسی علم کے بنیادی اصولوں پر یقین رکھتے ہوئے تحصیل علم شروع کر دیں گے تو پھر رفتہ رفتہ ان بنیادی اصولوں کی صداقت خود بخود سمجھ میں آتی جائے گی۔ اسی کا نام سند (Authority) کو ماننا ہے۔''

وہ مزید کہتا ہے کہ:

''دنیا کے بڑے بڑے اصول (جو آج اس طرح مسلمات میں داخل ہو چکے ہیں، کہ ہم ان پر جرح وتنقید کی کبھی ضرورت نہیں سمجھتے) ابتداء ان انسانوں کے ذریعے سامنے آئے تھے جن کی تائید کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ ان کے یقین محکم نے ہمیں ان صداقتوں سے روشناس کرایا۔ سند (Authority) کے تسلیم کیے بغیر کوئی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔''

اس بحث کے آخر میں راشڈل لکھتا ہے کہ جس چیز کو ہم شروع میں سند مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم اس اتھارٹی کے حکم کی تعمیل (طوعاً وکرہاً) کر رہے ہیں، رفتہ رفتہ یہ حقیقت ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ ہم اس کی تعمیل میں کسی شخص کی فرمانبرداری نہیں کر رہے بلکہ ایک منطقی اصول کی پابندی کر رہے ہیں۔

نظریہ تصوریت کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمائے مغرب اس نظریہ کی وضاحت میں دو مکتبِ فکر رکھتے ہیں۔

1۔ موضوعی تصوریت 2۔ معروضی تصوریت

1۔ موضوعی تصوریت:

نظریہ تصوریت کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکمائے مغرب اس نظریہ کی وضاحت میں دو مکتبِ فکر رکھتے ہیں۔

1۔ موضوعی تصوریت 2۔ معروضی تصوریت

1۔ موضوعی تصوریت

1۔ روایتی منطق میں موضوعی سے مراد ہے محمول کا محل۔ مثلاً قلم سفید ہے'' میں قلم موضوع ہے جس سے محمول سفید'' وابستہ کیا جارہا ہے۔

2۔علمیات میں وہ علم کا مرکز ہو۔ہستی، اَنا

3۔نفسیات میں وہ فرد جس کا نفسیاتی مطالعہ ومشاہدہ کیا جائے۔

موضوعی خصوصی نفسیاتی سے یہ عقیدہ مراد ہے کہ عالم کا علم ذہن کی کیفیات تک محدود ہے۔

اس میں حکمائے مغرب کے ایک حکیم بارکلے کے خیالات کو اہمیت دی جاتی ہے بارکلے کے تصورات کو موضوعی دو وجوہات کی بنا پر کہا جاتا ہے۔وہ دلائل کے زور پر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ تمام موجودات (Objects) موضوعی ہیں ان کا انحصار ذہن (عقل) پر ہے اور تمام موجودات یا تو آئیڈیا ہیں یا ذہن جو ان آئیڈیا کا مسکن ہے۔بارکلے کا ایک مشہور مقولہ ہے Esse est Principi جس کا مطلب ہے ہستی صرف ادراک کا نام ہے۔کوئی وجود ایسا نہیں جو اس ذہن سے علیحدہ رہ سکے جو اس کا وقوف کر رہا ہے۔لہٰذا مادی اشیاء محض نفسی عوامل ہیں۔بارکلے کے لیے حقیقت ذہنی یا نفسی ہے۔اس کے لیے تمام کائنات ذہنی ہے۔صرف ذہن اور اس کے مدرکات ہی حقیقت رکھتے ہیں۔جن آئیڈیا کا انحصار انسانی ذہن پر نہیں ان کا انحصار الٰہی ذہن پر ہے۔لیکن بارکلے کوئی ثبوت نہیں دیتا کہ خدا کا وجود ہے۔

منطقی طور پر بارکلے کے تصور پر کئی اعتراض ہیں لیکن طوالت سے بچنے کے لیے آر۔بی۔پیری کے دو اعتراضات کو سامنے لایا جاتا ہے۔

1۔یہ ابتدائی محمول سے تعریف (Definition by initial Predication) ہے اور اس مغالطہ سے مراد یہ ہے کہ کسی شے کی تعریف یا شناخت صرف اس کے پہلے تجربہ سے کی جائے اور کچھ نہ لیا جائے۔بارکلے بھی اشیاء کے بارے میں ایسی ہی بات کرتا ہے۔ہم اشیاء کو صرف آئیڈیا کی حیثیت سے جانتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اشیاء صرف یہی کچھ ہیں اور کچھ نہیں ہوسکتیں۔ممکن ہے اشیاء صرف آئیڈیا نہ ہوں بلکہ اور کچھ بھی ہوں۔

2۔مزید یہ کہ ایغو مرکزی مشکل (Ego-centric Predicament) کے تحت بحیثیت انسان ہونے کے ہماری یہ مجبوری ہے کہ جب تک کوئی شے حواس سے داخل ہو کر ہمارے ذہن میں آئیڈیا نہ بنے اس کا علم نہیں ہوسکتا۔اس مشکل کا احساس کیے بغیر اسے ذریعہ بنا کر موضوعی تصوریت کی نمائندگی میں شامل کیا گیا ہے اور اس میں بارکلے کے علاوہ، لاک اور ہیوم کے خیالات کو بھی بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

لاک کا خیال تھا کہ خارجی کائنات موجود تو ہے لیکن وہ نہیں جس کا علم ہمیں حواس کے ذریعہ ہوتا ہے۔اس کے اپنے خواص اور جوہر ہیں جو محسوسات کے دائرہ میں نہیں آتے۔بارکلے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں نے کہا کہ ذاتی خواص تو ایک طرف خارجی دنیا کی اشیاء کا جوہر (Substance) بھی نہیں ہوتا۔ان سب کا وجود نفس (ذہن) میں ہوتا ہے۔انسانی نفس (Mind) میں یا پھر خدا کے نفس میں۔ہیوم بالعموم لاک اور بارکلے سے متفق ہے لیکن بارکلے کے ''خدا کے تصور'' سے انکار کرتا ہے۔وہ نفس انسانی ہی کو مانتا ہے۔البتہ اس کے مدرکات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

1۔ وہ مدرکات جنہیں نفس انسانی بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ہیوم کے نزدیک نقوش (Impression) کہلاتے ہیں اور ان کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے۔

2۔ وہ مدرکات جن کا اثر مدہم ہوتا ہے، تخیلات کہلاتے ہیں اور ان کا تعلق فکر سے ہوتا ہے۔

(2) معروضی تصوریت:

معروض ایک کثیر المعنی اصطلاح ہے جس میں درجِ ذیل کو شامل کیا جاتا ہے جس میں:

1۔ وہ جو دائرہ حواس میں آئے

2۔ جو ذہن اور شعور کے سامنے ہو اور اس معنی میں معروض سے مراد ہوگی، مادی شے، خارج از وجود رکھنے والی چیز یا ہر وہ چیز جو حواس سے قطعِ نظر اور دائرہ حواس سے باہر ہو۔

معروضیت سے مراد یہ فلسفیانہ خیال ہے کہ ہماری فہم سے آزاد ایک عالم وجود رکھتا ہے اور اپنی موضوعیت کے باوصف اس کا علم ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ فلسفیانہ نظریہ ہے کہ جس کے مطابق علم کے دونوں موضوع اور معروض حقیقی ہیں اور مطلق کے تعینات یا مظاہر ہیں۔

اس فکر میں حکمائے مغرب کے ہیگل گرین، لائس اور ہیرٹ اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ سب مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ خارجی اشیاء خود ہمارے تخیلات (Ideas) ہی کا پرتو ہیں، لیکن یہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ ان کا انحصار کسی خاص فرد کے تخیلات سے ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ تخیلات تمام نوع انسانی کے نفس میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ تخیلات خارج میں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے اس مکتبِ فکر کا نام معروضی تصوریت قرار پایا۔

موضوعی فلسفیوں کی پیروی میں معروضی فلسفی بھی اپنا آغاز اس حقیقت سے کرتے ہیں کہ تمام موجودات جو ہمارے ادراک میں آتی ہیں اس کا انحصار ہمارے ذہن پر ہے۔ اس پوزیشن سے وہ اب جست لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ساری موجودات کا انحصار ذہن پر ہے۔ اس دعوے کو معقول بنانے کے لیے بارکلے نے تو خدا کا ذہن فرض کرلیا۔ معروضی تصوریت کے حامی مطلق تک پہنچتے ہیں جو ایک ہمہ گیر ذہن ہے اور تمام کائنات اور اس کی سچائیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کُل کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر ہستی کا انحصار ادراک پر ہے اور کائنات کی تمام اشیاء کسی نہ کسی ادراک کی موضوع ہیں تو ہمیں لازمی طور پر کسی ایسے مدرک کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو عالمگیر اور ہمہ گیر ہے اور جس کے ادراک پر تمام موجودات کی ہستی موقوف ہو۔ اس تصور کو مطلق تصوریت یا معروضی تصوریت کہتے ہیں۔

اس پر عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ بات مانی جاسکتی ہے کہ جس شے کا وقوف ہو رہا ہو اس کی ہستی کا دارمدار ادراک پر ہے۔ اگرچہ یہ بھی مشکوک ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ تمام موجودات خواہ اس کا وقوف ہو رہا ہو یا نہ، اس کا وجود ادراک پر منحصر ہے کسی طرح جائز نہیں۔

مطلق معروضی تصوریت کے نظریہ کو سامنے لانے والوں میں سے ہیگل کا ایک اہم مقام ہے۔ اس لیے آغاز ہی میں یہاں اس کے نظریہ کا خاکہ سامنے لانا مناسب سمجھا گیا ہے۔

ہیگل کے فلسفہ کا مختصر جائزہ:

ہیگل کا موقف منطق کے اِس اسوہ پر مبنی ہے کہ حقیقت کی نوعیت کا استناج اس واحد سوچ سے ہوسکتا ہے کہ یہ خود متناقص نہ ہو۔ حقیقت کو اِس منطقی اصول سے ثابت کرنے میں ہیگل دعویٰ اور جواب دعویٰ کے زور پر ترکیب تک پہنچتا ہے اور اس عمل کی انتہا ایسی ترکیب پر ہوتی ہے جو کسی جواب دعویٰ کے لیے دعویٰ نہیں بنتی۔ یہ آخری ترکیب مطلق حقیقت ہے جس میں کوئی تضاد نہیں۔

ہیگل کے مطابق نتیجے کو سمجھنے کے لیے اس ترکیبی عمل کا سمجھنا لازمی ہے۔ جدلیات کے بعد کا ہر مرحلہ پہلے تمام مراحل کا حامل ہوتا ہے جیسے یہ تحلیل میں ہو۔ ان میں سے کوئی شے بھی پوری طرح منسوخ نہیں ہوتی اور ایک لمحے کی طرح کل میں اپنا مناسب مقام دی جاتی ہے۔ اس لیے جدلیات کے تمام مراحل سے گزرے بغیر سچائی تک پہنچنا ناممکن ہے۔

مجموعی طور پر علم ایک حرکت ثلاثہ ہے۔ اس عمل کے لیے ہیگل تین الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جس کا مطلب ہے تنسیخ کرنا (To anual) تحفظ کرنا (To Preserve) اور بلند کرنا (To Elevate)۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر شے خواہ وہ سائنسی تصور ہو، ادبی تحریک ہو، قومی پالیسی یا مذہبی عقیدہ ہو اپنے متناقص میں گم ہو جاتا ہے اور کچھ بھی بالکل ضائع نہیں ہوتا۔ اس کی ابتداء حسی ادراک سے ہوتی ہے۔ جس میں صرف معروض کا شعور ہوتا ہے۔ پھر حواس کی تشکیکی تنقید کے ذریعے یہ محض موضوعی بن جاتی ہے۔ بالآخر یہ خود شعوری کی منزل تک پہنچتی ہے جس میں موضوع و معروض مزید جدا نہیں رہتے۔ یوں خود شعوری علم کی معراج ہے۔ بے شک ہیگل کے نظام میں یہی صورت ہونی چاہیے۔ کیونکہ منتہیٰ قسم کا علم وہی لازم آتا ہے جس کا عین کل کا حامل ہو اور جیسا کہ عین مطلق کُل ہے۔ اس لیے خود اس کے خارج میں جاننے کے لیے کوئی شے نہیں۔ یہ مطلق تصور ایک خالص فکر ہے جو خالص فکر کا تفکر کرتا ہے۔ یہ مطلق تصور میں، جس کے ساتھ ''منطق'' ختم ہوتی ہے۔ کچھ کچھ ارسطو کے خدا کی مانند ہے۔ یہ اپنی ذات کا تفکر کرنے والی فکر ہے۔ واضع طور پر مطلق کبریٰ اپنے علاوہ کسی اور شے کے متعلق نہیں سوچ سکتا کیونکہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہیگل کے تصورِ کُل کی نظریہ معروضیت سے نسبت کی وضاحت:

اس بحث کے بعد یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہیگل کے تصوریت کو معروضی کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہیگل کے نظام میں تمام محدود ذہن کسی لامحدود ذہن میں بندھے ہوئے ہیں اور جدلیاتی طور پر ان کا مطلق ذہن پر ایسے انحصار ہے کہ حقیقی صرف مطلق ذہن ہی رہتا ہے محدود ذہن نہیں جس میں موضوعی نظریات کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قضیہ کا موضوع مطلق ہے۔ علاوہ ازیں ہر مدرک (Knower) کے نقطہ نگاہ سے باقی تمام مدرک اور ان کے تمام موضوعات (object) اس سے الگ وجود رکھتے ہیں۔ یہی حال حکم (judgement) کا ہے۔ ہر حکم دو الگ الگ چیزوں

کے درمیان رشتہ قائم کرتا ہے۔ پس اندرونی رشتوں کے باوجود جہاں تک اشیاء کا اختلاف ہے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اندرونی طور پر وہ مطلق سے وابستہ ہیں لیکن اختلافات کی بدولت وہ جدا اور خودمختار نظر آتی ہیں۔ اس لیے اس کی تصوریت کو معروضی کہا گیا ہے۔

اس کے باوجود ہیگل کا نظریہ ہے کہ کائنات کے کسی حصے کی نوعیت اس کے دوسرے حصوں کے ساتھ اور کُل کے ساتھ رشتوں کے حوالوں سے بغایت متاثر ہوتی ہے اور یہ کہ کسی حصے کی اس وقت تک صحیح نوعیت بیان نہیں کی جاسکتی جب تک کہ اس کا کُل میں مقام متعین نہ ہو جائے۔ چونکہ کُل میں اس کا مقام باقی تمام دوسرے حصوں پر منحصر ہوتا ہے اس لیے کُل میں اس کے مقام کی صحیح نوعیت بیک وقت کُل میں ہر دوسرے حصے کے مقام کا بھی تعین کرے گی۔ اس لیے توضیع صرف ایک ہی ہوسکتی ہے۔ کُل کی سچائی کے سوا کوئی سچائی نہیں ہوتی۔ اور اس طرح کُل کے سوا اور کوئی حقیقی شے نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی حصہ جدا ہو جانے کی صورت میں اپنی نوعیت میں یکسر بدل جاتا ہے۔ اور اس لیے مزید بالکل ایسا ظاہر نہیں ہوتا جو وہ حقیقی طور پر ہے۔ اس کے برعکس جب ایک حصے پر کُل کے رشتے کے حوالے سے نظر ڈالی جاتی ہے جیسا یہ ہونا چاہیے تو یہ خود قائم بالذات دکھائی نہیں دیتا اور سوائے کُل کا حصہ ہونے کے خود قائم رہنے کے قابل نہیں ہوتا اور سچی حقیقت کُل ہی ہے۔ کُل کے سوا ہر شے باہر کی اشیاء سے رشتوں میں منسلک ہے۔ اس لیے کسی شے کو بھی جدا ہونے کی صورت میں بالکل سچا نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے عین کُل، ایک وحدت کی صورت میں تنہا حقیقت ہے۔

نظریہ ہیگل کا تنقیدی جائزہ:

1۔ ہیگل خود اپنے فلسفے پر نکتہ چینی کرتا تھا جیسے ہر دعویٰ کا جواب دعویٰ ہوتا ہے جو دعویٰ کی نفی کرتا ہے۔ اس طرح ہیگل کا فلسفہ بھی جواب دعویٰ چاہتا ہے جو اس کی نفی کرے۔ یعنی خود ہیگل کا فلسفہ ہی ہیگل کی تردید کرتا ہے۔

2۔ ہیگل کا فلسفہ نظری ہے عملی نہیں اور عملی بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا۔ حقیقت مطلق ایک نامعلوم حقیقت ہے اس لیے اسے علم کا مقصد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک بند قلعہ ہے جس میں کسی گوشہ سے بھی تازہ ہوا نہیں آسکتی۔ اس لیے ولیم جیمز کہتا تھا کہ اس حقیقت میں میرا دم گھٹتا ہے۔

3۔ سائنس کا مقصد مکمل صداقت یا مطلق حقیقت کو جاننا ہے لیکن سوال ہے کہ کیا مطلق حقیقت کو کلی طور پر جانا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ ہر انسان کا اپنا نقطہ نگاہ ہے اور ہر سائنس کا اپنا محدود دائرہ اور تناظر اور صرف مطلق ذہن ہی مطلق حقیقت کو جان سکتا ہے۔

ہیگل کا فلسفہ غیر سائنسی ہے۔ ہیگل خود کو معروضی کہتا ہے اور جدلیات جہاں بھی لے جانا چاہے، جانے کو تیار ہے لیکن آج کل سائنس جدلیات کو نہیں بلکہ ریاضات کو قطعی علم کا ضامن سمجھتی ہے اور اگر قطعی درست علم حاصل نہ ہوسکتا ہو تو احتمالی علم شماریات کے ذریعے چاہتی ہے ہیگل کا ماورائی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اس لیے سائنس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔

4۔ قانون تعلیل کے بارے میں ہیگل مانتا ہے کہ علت اور معلول کا یہ رشتہ حواس سے محسوس نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کا پتہ

علت اور معلول کے مضمرات سے لگایا جا سکتا ہے۔ اگر علت سے مراد معلول کی علت اور معلول سے مراد علت کا معلول ہو تو علت اور معلول لازم و ملزوم الفاظ بن جاتے ہیں۔ یہاں ہیگل کے ہاں ایک ابہام پایا جاتا ہے۔ وہ اضمار (Implication) اور علت میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ علت تو اشیاء کے درمیان ہوتی ہے اور اضمار تصورات کے درمیان۔ اضمار کے درمیان لزومت کا رشتہ ہوتا ہے لیکن علّت میں ظن اور اجتمال بھی ہوتا ہے۔

5۔ مخالفین کا کہنا ہے کہ ہیگل کا فلسفہ کلیت پسندی (Totalitarianism) اور قدامت پسندی کو فروغ دیتا ہے۔ اگر کل کے ہر جزو کا اپنا مقام ہے تو پھر اسے کیوں بدلا جائے۔ ہر جزو اپنی جگہ اچھا یا برا ہے، لیکن یہی اس کا مقام ہے۔ اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا تبدیلی کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

نظریہ تصوریت کی ہی ایک ذیلی شاخ نظریہ وجودیت متعارف کرائی جاتی ہے، جس پر تفصیلی بحث ہم پچھلے باب میں سامنے لا چکے ہیں۔ اب ہم نے یہاں تک ماضی کے نظریہِ علم کی تجربیت اور تصوریت کی دونوں اہم نظریات کی اہم شاخوں کا مطالعہ کر لیا ہے، جو ایک دوسری کی مخالف سمت میں رواں دواں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ عصرِ حاضر میں البتہ کوشش کر کے کانٹ نے اِن دونوں نظریات میں مفاہمت کر کے ایک نیا منطقی نظام متعارف کرا کے فہمِ علم کے مسلۂ کا حل پیش کر دیا ہے۔

انسانی فہم میں تجربہ کی اہمیت:

کانٹ کے نظریہ علم کے جائزے میں پہلے سوال پیدا ہوتا ہے کہ احساسات اور ادراکات کا مفہوم کیا ہے۔ اور انسانی ذہن اول الذکر کو موخر الذکر میں کس طرح تبدیل کر دیتا ہے؟ بذات خود احساس صرف مہیج کا شعور ہے۔ زبان کو ذائقے، ناک کو (خوشگوار یا ناخوشگوار) بُو کا، کانوں کو صوت کا، جلد کو حرارت کا، آنکھ کو چمک کا، اُنگلیوں کو دباؤ کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں تجربات کی خام صورتیں ہیں۔ شیر خوار بچہ اسی طرح ذہنی طور پر ٹٹول ٹٹول کر کام چلاتا ہے۔ مگر اس احساس کو علم نہیں کہتے۔ البتہ جب احساسات ایسے معروض کے محور پر گھومنے شروع ہو جاتے ہیں جو پابند زمان و مکان ہو تو مہیج کا اتنا شعور نہیں ہوتا جتنا ایک مخصوص شے کا ہوتا ہے۔ یہ ادراک کی منزل ہے۔ یہاں احساسات نے علم کی صورت اختیار کر لی ہے۔

احساسات میں دیکھا گیا ہے کہ ہم صرف ان احساسات کا انتخاب کرتے ہیں جو ہمارے مقصد کے مطابق ادراکات کے سانچوں میں ڈھالے جا سکتے ہیں یا جو فوری خطرے کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ احساسات اور افکار انتخاب کر کے ان کے عمل کا رُخ متعین کرنا ذہن کا کام ہے۔ وہی ان خادموں کا آقا ہے۔

کانٹ کا خیال ہے کہ ذہن، جو انتخاب اور تالیف و تدوین کا وسیلہ ہے، اس مواد میں ادراک کے لیے جو مہیا کیا جاتا ہے، دو سادہ سے طریقے استعمال کرتا ہے یعنی حاسہ زمان اور حاسہ مکان۔ واضح رہے کہ زمان و مکان غیر مرئی ہونے کی بنا پر ایسی اشیاء نہیں جن کا ادراک ہوتا ہو بلکہ یہ ادراک کے طریقے اور شکلیں ہیں۔ ان کے ذریعے احساسات بامعنی بنتے ہیں تو گویا زمان و مکان آلات ادراک ہیں۔ ان کے بغیر احساسات کبھی ادراکات کی صورت اختیار نہیں کر سکتے۔

اس کی وضاحت کانٹ ہی کی ''تنقید عقل محض'' کے اس جملے سے ہو جاتی ہے کہ:

افکار بغیر مافیہ کے محض خالی چیزیں ہیں اور ادراکات بغیر تصورات کے محض ایسی آنکھیں ہیں جن میں روشنی نہیں۔ فہم کسی بھی شے کو محسوس کرنے اور حواس فکر کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ علم ان (دونوں) فہم و حواس کے متحدہ عمل کے تجربہ کے نتیجے میں وارد ہوتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ تجربہ کے بعد انسانی فہم کی مُختصر طور پر بھی وضاحت کی جائے۔

انسانی فہم میں قبل تجربی عقل کی اہمیت:

انسانی فہم (عقل) کو صرف تجربہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ کیا ہے، لیکن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ ہے ہمیشہ وہی ہونا بھی چاہیے اور ہمیشہ وہی ہوگا بھی۔ اس لیے تجربہ صداقت ہائے عمومی کا ماخذ کبھی نہیں بن سکتا اور ہماری عقل جو خاص طور پر صداقت ہائے عمومی دریافت کرنے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔ اس کی تجربات سے تسکین نہیں ہوتی البتہ اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔ صداقت ہائے عمومی جو دراصل لزوم داخلی کی کیفیت سے متصوف ہیں تجربات سے مستغنی و ماوراء ہوتی ہیں۔ وہ بجائے خود واضح اور یقینی ہوتی ہیں۔

کانٹ کے فلسفہ میں اولیاتی (A priori) کا استعمال ان حقائق اور تصدیقات کے لیے ہوتا ہے جن کی صحت و صداقت حسی تجربے سے آزاد ہو اور جو وجوبی اور کلی صداقت کا حامل ہو۔

ان صداقتوں کی لازم اور مطلق ہونے کی خصوصیت ہمارے ذہن کی داخلی ساخت پہ مبنی ہے یعنی ہمارا ذہن جس فطری اور اٹل طریقہ پر کارفرما ہوتا ہے یہ صداقتیں اس کارفرمائی کے خاص اسلوب کا نتیجہ ہیں۔

کانٹ کہتا ہے کہ انسان کا ذہن بے حرکت دُم سے مشابہ نہیں جس پہ تجربات اور احساسات اپنے مطلق لیکن متلوّن نشان ثبت کرتے رہتے ہوں۔ انسانی ذہن، ذہنی کیفیات کے سلسلوں کا تجریدی نام بھی نہیں۔ یہ دراصل ایک کارفرما عضو ہے جو احساسات کو مرتب کرتا ہے اور تصورات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔

معقولات مرتب کرنے کے لئے ادراک کے قبل تجربی مقولات:

احساسات کو مرتب کرنے میں جیسا کہ وضاحت کی گئی ہے زمان و مکان کو وجدان کی صورتوں (Forms) کو سامنے لا کر ادراکات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کانٹ نے فہمِ علم کے لیے درجِ ذیل بارہ ارتقاء یافتہ ادراک پر فکر کے قبل تجربی مقولات کا اطلاق کیا ہے تاکہ تعقلات کی صورتوں کو مرتب کیا جائے۔ قبل تجربی مقولات کو سامنے لا کر قیاس کی صورتوں سے استنتاج کرتا ہے۔

تعلقات مرتب کرنے کے لئے ادراک کے قبل تجربی مقولات (Categories):

پہلی۔ کمیت (Quantity)

1۔ وحدت (Unity) 2۔ کثرت (Plurality) 3۔ مجموعہ (Totality)

دوسری۔ کیفیت (Quality)

4۔ حقیقت (Reality) 5۔ نفی (Negation) 6۔ حد (Limitation)

تیسری۔ اضافت (Relation)

7۔ جوہر و حداث (Substance Accident) 8۔ علت و معلول (Cause and Effect)

9۔ بدل (Reciprocity)

چوتھی۔ جہت (شانیت) (Modality)

10۔ امکان (Possibilty) غیر امکان (impossibilty)

11۔ وجود (Existence) غیر وجود (Non existence)

12۔ لازمی (Necessity) امکانی (contigency)

یہ بارہ مقولات بھی اسی مفہوم میں موضوعی ہیں، جن میں زمان و مکان ہیں، یعنی ہماری ذہنی ساخت ایسی ہے کہ جو تجربہ بھی ہم کرتے ہیں اس پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ احساسات کے موادِ خام سے فکر کی شکلِ کامل تک، عملِ ذہنی دو مرحلوں سے گزرتا ہے۔

1۔ پہلے مرحلے میں احساسات پر ادراکات کی صورتوں کا اطلاق کر دیا جاتا ہے تاکہ احساسات مرتب ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ادراک کی یہ صورتیں زمان و مکان ہیں۔

2۔ دوسرے مرحلے پر ارتقاء یافتہ ادراک پر فکر کے مقولات کا اطلاق کیا جاتا ہے تاکہ تعقلات کی صورتوں کو مرتب کیا جائے۔

ان دونوں کے اشتراک سے علم کے حصول کے لیے کانٹ نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں یعنی حواس اور عقل علم کے اجزائے لاینفک ہیں۔ کانٹ کا فلسفہ انتقادیت ہے اور وضع تصورات میں کانٹ احساسیت سے اس خیال میں متفق ہے کہ مادہ تصورات حواس مہیا کرتے ہیں اور اس لحاظ سے تصوریت کا ہم خیال ہے کہ صورتِ تصورات عقل مہیا کرتی ہے۔ عقل اپنے قوانین سے احساس کی کثرت کو تصورات کی وحدت میں تبدیل کر دیتی ہے اس لیے کانٹ کہتا ہے کہ عقل کو کوئی نظام فلسفہ بنانے سے پہلے اپنی قویٰ اور ذرائع و آلات تعمیر کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیے۔ کانٹ نے کوئی مکمل نظام علم نہیں دیا بلکہ فلسفیانہ فکر کا ایک مقدمہ اور نہج تعارف کروایا ہے۔

قرآن سے بھی اِس نظریہ کی تائید حاصل ہوتی ہے کہ:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (17:36)

اور جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگو۔ کیونکہ سماعت و بصارت اور فؤاد میں سے، ہر ایک سے باز پرس ہونی ہے (کہ تم نے ان سے کام لیا تھا یا نہیں)؟

فُؤَادَ: انسانی جسم میں وہ مرکز، جو حواس خمسہ سے، وصول شدہ معلومات کو، سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا ہے، اس کو فُؤَادَ کہتے ہیں۔ فیصلہ کرنے کا یہ مرکز، جسم کے کس حصے میں ہے، اس بات کا انسان کو علم نہیں ہے۔ اسی کو قلب بھی کہتے ہیں۔

اسی فلسفیانہ فکر کی روشنی میں علم کو مزید وسعت دینے کے لئے منطق کے استقرائی اور استخراجی اصولوں اور طریقہ کار سے مدد لی جاتی ہے۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیرِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تاکہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہوچکی ہے۔ یہ جلدیں 20X30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورۃ الفاتحہ	(1)	240	200/-
سورۃ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-
سورۃ البقرہ (اوّل)	(2)	500	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-
سورہ آل عمران (اوّل)	(3)	472	500/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-
سورۃ الانفال	(8)	210	250/-
سورۂ توبہ	(9)	530	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-
سورۂ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-14-15)	500	500/-

سورۃ النحل	(16)	334	300/-
سورۃ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-
سورۃ الکہف، سورۃ مریم	(18-19)	532	500/-
سورۃ طٰہٰ	(20)	416	350/-
سورۃ الانبیاء	(21)	336	300/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ العنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ روم، لقمان، السجدہ	(30-31-32)	444	400/-
سورۃ الاحزاب، سبا، فاطر	(33-34-35)	570	400/-
سورۃ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ الصفٰت، ص، زمر	(37-38-39)	450	400/-
سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40-41-42)	624	550/-
سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45-46-47)	520	500/-
سورۃ الفتح، الحجرات، قٓ، الذاریات، الطور، النجم	(48-49--51-50-52-53)	550	500/-
سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55-56-57)	384	400/-
28واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	-64-65-66) (58-59-60-61-62-63	300	300/-
29واں پارہ (مکمل)		544	400/-
30واں پارہ (مکمل)		624	400/-
شرح جاوید نامہ		800	1000/-
فہرست موضوعات مطالب القرآن فی دروس الفرقان		800	1000/-

Principle for Success and Reasons for Downfall – By Sir Syed, 1896

(ا ل اور ل و ہ)

(Translated by: Mansoor Alam)

[*Maqalaat-e Sir Syed; Ed. Maulana Ismail Panipati; Publisher, Majlis-e Taaqqi-e Adab, Lahore, 1963*]

Some learned elders have said: a nation is indeed fortunate whose past was bight and worth remembering and that nation remembers its glorious past. On the other hand, and a nation is indeed unfortunate if it does not remember its glorious past. There is no doubt that our nation's past history is worth remembering, but I do not want to mention it for two reasons.

First, it has not been that long since our downfall: signs of our glorious past are still present today – in India, in the Arab world, in Africa, and in Europe. Second, since we have become incompetent and powerless, therefore, what is the use of being proud of our ancestors' achievements? A famous saying is: it harms one's integrity if one keeps mentioning one's youth's exuberance in old-age; it damages one's confidence if one keeps talking about past supremacy when one's present life is pitiful.

Our situation has become so bad and so hopeless that it is doubtful if we are even capable of learning any lessons from the glorious past of our ancestors. Under the auspices of Mohammedan Education Conference we have been reciting our past glory for ten years – in poetry and in prose — but nothing useful has come out of it. In fact, those past stories became lullabies turning us into dreamers. Therefore, it is better for us to set aside such thoughts and to focus on the present, and try to do something that could uplift our community, although even that seems not very hopeful. One of my good friends says: once a stone is thrown it does not stop until it reaches the ground. This is the condition of our nation's downfall: until it becomes totally pitiful and despicable; until it reaches the very bottom of the pit and gets muddied with extraordinary humiliation – it is not going to stop in the middle. We are even waiting for our freefall so that we might bounce a little with its impact. But our situation is so sad that we have even lost the sense of our depravity, and hope without hope of being bounced up by the impact of our fall. So, our nation is waiting for that freefall, no matter how difficult and useless that may be, because the time for bouncing has also past. In the words of Ghalib:

If it is so hard to meet you, it is fine with us;
The difficulty is that this is not difficult for us!

So, please focus on the present and work to improve the human condition according to demands of the time.

First of all we need to ponder: what kind of government it is that under whom we are leading our lives currently. The freedom of religion and security of life that we have under the British government we did not see better than that under any other government before.

The anarchism that used to prevail do not exist anymore now. Everyone and every community has opportunity for progress in education and commerce. Travel to far off places that was not even conceivable before is now possible. Getting news about the world has become easier even for the common people that was not available to kings of yesteryears.

We do not respect this peaceful times because we have not seen the tumultuous times caused by mayhem of militia warfare when travelers were looted; and when someone was going on journey then his friends and relatives used to see him off by wishing goodbye with watery eyes because they were not sure if he will return alive. People do not appreciate the present peaceful times because they have not seen the past turbulent and dangerous times. So, my advice to my people is that please consider this time as a period of respite and try to work hard to improve the human condition of your people through community and philanthropic effort.

When the government was in our hands the progress and development of our people required different approach. But that is not the case at the present time. There is a very good saying of Sir Auckland Calvin, the former lieutenant governor, that if Taimur's sword is kept aside then one should not forget what went on to sharpen it. The power, the steadfastness, the bravery, the fortitude – should never be forgotten. Today's Muslims do not need the emotional and sharp mentality and power of their ancestors. All they need is their good qualities that led to that sharpness and their power and authority. However, to acquire those qualities in the changed circumstances we need to focus our attention in a different direction.

Anyway, as far as I think, everyone agrees with me that Muslims are in extremely dire straits and despicable situation now. They must find a way out of this degradation. They must find out what methodology to use for progress, notwithstanding the different opinions we have about going about this.

Our religious scholars think that religious education and commitment

have gone down – and restoring these will lead to our community's progress. If by this progress it means spiritual progress then I accept this. But, at this time, we are discussing about worldly progress. My dear friends, do not think that by saying "worldly progress" I am ignoring Islamic progress. Never! I understand that if Muslims are suffering degradation and humiliation then the shine of Islam will also be blunted. Worldly progress and spiritual progress are inseparable. Worldly progress done with sincerity, honesty, and righteousness leads to spiritual progress. But I am afraid, God forbid, that Muslims, in their complacency, might lose this period of respite and come under the grip of Allah's Law of Requital: وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) – And humiliation and wretchedness were stamped upon them and they were visited with wrath from Allah.

I firmly believe that those of us who want to work for improving human condition of our people and want them to progress in worldly education, we must also have plans to educate them about Islam and urge them to fulfil Islamic obligations – prayer, fast, hajj, zakat, etc. We must provide them holistic education encompassing all aspects of life. A hadith in Bukhari and Muslim reports: "a person came to the Messenger of Allah (May peace be upon him) and said: Messenger of Allah, direct me to a deed by which I may be entitled to enter Paradise. Upon this he (the Holy Prophet) remarked: You obey Allah and never associate anything with Him, establish the obligatory prayer, and pay the Zakat which is incumbent upon you, and observe the fast of Ramadan. The person said: By Him in Whose hand is my life, I will never add anything to it, nor will I diminish anything from it. When he left, the Prophet (PBUH) said: He who is pleased to see a man from the dwellers of Paradise should catch a glimpse of him." Therefore, our road to paradise is very clear and our Prophet's life provides inspiration for moving forward. Though our life in this world is very short compared to the life of the Hereafter, but how unfortunate that to pass this few short years of worldly life has become so hard and so burdensome for people.

That time has passed when one used to get bestowed with accolades and doughs for writing flattering fanciful poetry for ruling elites; or granted estates or official positions or pensions without merits. But the world has changed now. It is the age of scholarship and knowledge-based merit achievements. My dear friends, the great difficulty is that if few of our people achieve this high meritorious status then this is not going to be very helpful because our nation will still not escape being labeled retrograde, downtrodden, and undeveloped. These few educated people

won't be able to do much of anything if there is large scale illiteracy among our people. A brave person alone cannot surpass a mountain. Our people's condition will not improve (and the derogatory label attached to them cannot be erased) unless and until they progress educationally and intellectually as a nation.

You may be feeling somewhat uncomfortable in your hearts and thinking: that it is impossible to educate our entire nation; that even in advanced countries of Europe not all persons are educated; that even in London there are many uneducated people. If that is the case in Europe then people may be right in asking: How is it possible then to educate all our people in India?

Well, there criticism is no doubt valid. But when we talk about an educated nation then it does not mean that all people of that nation have become expert in science, logic, and medicine – and have become Socrates or Hippocrates – because such people are very rare in any nation. Instead, what we mean by educated nation is that there is cultural awakening in the populace for erudition and thought and most people have developed the taste for acquiring knowledge; that though most people may have had only basic education, but their hearts are eager for development and progress of the entire population. Commoner or not, all are active in improving the human condition of their people in one way or the other; and that, that nation justly feels proud to have people of eminence in their midst. Aren't all British people proud of Mr. Gladstone, Lord Salisbury, or Lord Denis, not just their associated party people? Weren't we proud of our eminent personalities when time was on our side? But, now, time is that neither such eminent persons are among us nor our people have that intellectual mentality, nor do they have the sense and feeling for national progress? So, they have justly earned the title of backward, illiterate, and uncivilized nation as a whole.

Sultan Mahmood asked Firdausi to write Shahnamah and promised him one gold dinar for each verse. These days no reward or compensation happens like this. This is the age of copyright, trademark, and patent laws. These are merit-based awards paid by the people because they value knowledge and creativity. The same laws are in force in India but do we have examples to celebrate?

There are plenty of newspapers in India now. We have heard three things about them: that there are no buyers; that those who have subscribed do not pay the bills; or the complaint that though we did not subscribe but we are getting the papers. The reason for all these issues is that our nation is not educated; that it does not have the taste for knowledge. Unless

education spreads in the populace and unless its mental level is not elevated there will be no progress of any kind in our nation – whether in education or in profession or in business and commerce. Educated people are needed who are hardworking, sincere, and honest for the development of business and commerce. Advanced education, character integrity, trust and honesty are major aspects required for the overall progress and development of a people.

Therefore, no matter how one looks at it, without overall educational advancement of a people no progress is possible for a nation. My dear friends, you may be wondering how is it possible to provide advanced education for an entire nation? I want to repeat that, yes, this criticism is valid. But I want to emphasize that this is an evolutionary process. When some people in a nation equip themselves with advanced education and training then its positive impact spreads among the uneducated people of that nation; and it spurs interest and reverence for acquiring knowledge that leads to feeling of honor and rejuvenation among the larger population. Don't we see the stark difference of mindset in this respect between the common people of Europe and our own people? If we see, then there is no other reason for this than the fact that there are many educated and trained people in Europe whose positive momentum has spread over the masses.

Therefore, we have to deal with this immediate issue before us: that we do not have a critical mass of educated and trained people amongst us that could create the spark among the masses as it has done in Europe. I have deliberately ignored here religious knowledge because it is considered sacred. As I have mentioned before we are discussing here the progress related to the knowledge of physical sciences.

One group thinks that we have all the knowledge that we need. Our ancestors accomplished everything in the field of knowledge. We just have to acquire their knowledge. We do not need any other knowledge. Their famous saying is: if you want father's inheritance then learn from father's knowledge.

Is this true my friends? Do you think that the knowledge that our ancestors gave to the world has not further progressed? Have not the knowledge of pharmacy, medicine, and surgery that our ancestors gave to the world progressed further? Have not the knowledge of philosophy, physics, chemistry, algebra, arithmetic, etc. that our ancestors gave to the world advanced further? Has not new knowledge that our ancestors did not possess been invented? Has not further advancement been made in literature, in its style and in its delivery mechanism. My dear friends,

please understand that whatever knowledge was there with ancestors was like seeds. Now those seeds have developed and grown into giant fruit giving trees of modern knowledge that is so different that it is unrecognizable form our ancestors' knowledge – and new inventions have been made that even their seeds our ancestors did not have. Moreover, errors in the Greek knowledge that have been revealed, are in addition to the new knowledge that has been created in this age.

Our ancestors were proud that they were able to garner the knowledge of math, logic, philosophy, medicine – in fact, all the knowledge that the Greeks had created. When Greeks' errors have been exposed and new knowledge is available to us now, then why we should slavishly insist that we continue with the Greek knowledge.

So, we must ponder and decide what knowledge is useful for our nation at this time. Should we acquire the modern progressive new knowledge or the old and stale knowledge of the Greeks that is unworthy of revitalizing the prospectus of even elementary school what to say of universities, and cannot stand on its own feet in light of the new knowledge?

If this opinion of mine is right then we have no choice but to inspire our people to acquire modern knowledge that is progressive as well as useful. Now, as a whole, this is available in three languages: French, German, and English. We are not that familiar with French and German. English is the language of our rulers and it is useful for many other things. So, practically, it becomes the best choice and the means of acquiring modern knowledge.

One group amongst us thinks that unless modern knowledge is translated into our mother tongue, no progress can take place if we teach it in another language. No doubt I prefer to have as many books as possible in our mother tongue; but no matter how true this logic may be it is not going to be very practical. In the reign of Harun Rashid and Mamun Rashid only few Greek books had been translated. But in this age so many books have been translated that ten reigns of the likes of Harun Rashid and Mamun Rashid could not have achieved these many translations. Also, despite this, there has not been even a single case of historical evidence that a people, by using a different language than the language of their rulers, have advance themselves in knowledge. Therefore, it is incumbent on us that we use English language to advance ourselves in modern knowledge.

There is no systematic means to acquiring modern knowledge in India. There are only few universities that have coopted our education into their

hands. It is due to our negligence and incompetency that our education has gone into their hands which is not enough to fulfil our people's aims and aspirations; nor can the government fulfil our nation's needs, especially that government which is from another country and that is ruling us. It is a fact that no other nation will do for us what we ourselves as nation are supposed to do for our people's education, welfare, and wellbeing.

It is sad that our nation does not have the capability to fulfil this need. Therefore, we have no choice at this time but to patiently accept whatever education is available to us and reconcile with our slavish dependence on universities. The present education no doubt provides mental education and improves our thoughts; and people's hearts feel that we are in downfall mode as a nation and are suffering deprivation. As a result people start dreaming about their educational progress and want to control the direction of their future knowledge. When a large number of our people start dreaming like this, and the kind of thoughts that I mentioned earlier become mature and steadfast in their hearts, then this will be the first step towards the progress of the nation. However, if appropriate training is not included along with the current education, then we should know that we will have thorny tree yielding bitter fruits flailing our future generations instead of a fruit-giving tree inspiring and uplifting them. So, my dear friends, it is your duty that you must focus on proper training of your children even more than their education. By training I do not mean the obsolete training promoted by our obscurantists that is nothing but robotic movements and mimicry. Instead, by training I mean a training that produces character attributes of honesty; of integrity; of true morality; of true love of service to our nation; of true sympathy for our people; of self-respect; of true sincerity; and of responsibility and accountability to carry out ones duty. This kind of training cannot happen suddenly. But if our youth can be channeled on this road then, hopefully, in future, people with these character attributes may take root in our nation.

But it is sad to see that our people are careless about even the current defective education which, nevertheless, is needed in the beginning and is the first step towards our people's progress. No doubt we have rich and poor among our people. But to say that our people cannot afford the available education is not only irresponsible but, please forgive, if I say outright lie. The real reason for this is that we are careless about our nation's education; we are careless about our nation's progress; we are careless about our nation's success. We do not give priority to spending

money on education over other things. Even if someone feels excited about education then he spends money for his own selfish goals, for his own narrow interests, for his own ulterior motives, not for our nation's progress. Although if we look at the principles of Islam then we find clearly that a philanthropic deed is good, pious, and righteous only if it is done to solve some real problems hampering our people's progress. I do not think this kind of selfish philanthropy has any weight in the sight of Allah. When I look at this kind of philanthropy of our people then I think it is no more than the "pious act" of the old woman who stands waist deep in the river Ganges and drops her valuable bangles its waters and says, "O mother Ganges! I am sacrificing my precious bangles to you, forgive my sins!"

There is no doubt, that along with other things, the expenditure on education is also going up day by day; and without money, and other expenses that go with it, education is not possible. So, those who can afford, why aren't they helping in this venture for the sake of their people's education? If they were willing to spend only three percent of their income then millions may be collected for educating our nation.

How shameful that we never think of our nation's welfare and success and spending even a single penny seems difficult for us! But if we know that spending money on certain matter will make government officials happy – whether it is building a mosque or school or hospital or establishing a girl's school or any other thing– then we, especially the rich amongst us, show great philanthropy and donate lot of funds while at the same time they hope for earning rewards in the Hereafter. Wonder of wonders! How aptly Saadi puts this attitude: *You think you are going to Kaaba but the road you are traveling goes to Turkey!*

In the past the education system was different and its expenses were very limited. Students lived in mosques or monasteries. Local families created a schedule amongst themselves to provide them meals. They were also surviving on with food from funeral services and anniversary offerings and free public kitchens. Those who are of my age or older and have visited Al-Azhar should have seen this kind of arrangement for its students. Its signs are found in Islamic madrasas in India even now. Their clothes are very basic kurta pajamas. Please do not think I am putting them down by mentioning these things. Many highly respected and literary personalities have been produced by these madrasas. My point of mentioning this is to highlight that this simplistic low-cost educational system is not going to work in this day and age, especially for acquiring knowledge through English medium.

(To Be Continued)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہوجائے گی۔یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔اس میں یہ دونوں شعبے باہم گرمدغم ہوجائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہوجاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کررہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرکے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہوسکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کرسکتا ہے۔خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 72
ISSUE
2

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666 E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/
www.youtube.com/idaratolueislam/

بیادِ غلام احمد پرویز

عبدالعزیز خالد

ہو گیا رخصت بساطِ تنگنائے دہر سے
اک خدا آگاہ، روشن فکر مردِ خود گرے

دانش و بینش کا پیکر، پُر بہار و خوش صفات
کلک و قرطاس و لبِ اظہار جس کی کائنات

اک ادارہ، ایک تحریک، اک مشن تھی جس کی ذات
شمع رکھی جس نے روشن فکرِ قرآنی کی تاحینِ حیات

طعنے گمراہی کے سنتا، وار بدنامی کے جو سہتا رہا
بات اپنے دل کی بیباکی سے لیکن برملا کہتا رہا

مہرِ خاموشی لگی خوفِ فسادِ خلق سے
جس کے ہونٹوں پر نہ پل بھر کے لئے

(کیوں نہ ہو جدت پسندی کو اِبا تقلید سے
کیا دماغِ نکتہ پرور کور مغزوں سے ڈرے؟)

جہل فتوے جس کے کفر و قتل کے دیتا رہا
کشتیِ عمرِ رواں جو بحرِ ہیبت ناک میں کھیتا رہا

قرضِ مرگِ ناگہاں سے روز جو نقدِ نفس لیتا رہا

زندگی بھر تنگ ظرفی سے کیا جس نے نباہ
اک زمانہ جس کے عزم و استقامت کا گواہ

بے گناہی کے سوا کیا تھا بھلا اس کا گناہ؟
تھی بقولِ محرماں اس کو نہ حرصِ مال و جاہ

باوجودِ بے نوائی بے محابا، بے پناہ
کچھ نہ رکھتا تھا وہ اقبالی قلندر

جُز دو حرفِ لا اِلٰہ

کوہکنؔ کی جس میں پامردی، یہ وہ پرویز تھا
اور اسی باعث تھی شیریںؔ خرد اس پر فدا

صاحبِ فرہنگ، اندیشہ سگالے، عاقلے
کہتے تھے جس کے عقیدت مند ''بابا جی'' اُسے

وہ وفاداریٔ بشرطِ استواری کی مثال
عمر بھر کی بے قراری کا ثمر جس کا کمال

تھے بہم جس میں مذاقِ منطق و ذوقِ جمال
آگہی کی اِک فروزاں شمع تھی جو بجھ گئی

آہ بیدردی تری! اے زندگی! اے زندگی!